ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

NOVEMBER – 1987

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ

حیاتِ نو

جلد نمبر ۲ ——— شمارہ نمبر ۱۱

نومبر ۱۹۸۶ء

• مدیر منتظم ——— نور محمد فلاحی

• مدیر ——— طارق فارقلیط فلاحی

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

٭ سالانہ زر تعاون	۳۰ روپئے
٭ خصوصی تعاون	۱۰۰ روپئے
٭ غیر ممالک سے	۱۵ امریکی ڈالر
٭ فی شمارہ	۳ روپئے

ترسیل زر کا پتہ: دفتر ماہنامہ مجلہ حیاتِ نو۔ جامعۃ الفلاح۔ بلریا گنج، اعظم گڈھ یوپی ۲۷۶۱۲۳

آفسیٹ: تجلی پریس بڑے چاند پورہ، دہلی ——— کاتب: رفیق احمد شاہ پوری، کندھرپورہ، اعظم گڈھ

نقوش حیات نو

اداریہ
عظیم انسان عظیم کردار — ایڈیٹر

بحث و نظر
تدبر قرآن پر ایک نظر — مولانا جلیل احسن ندویؒ
بامیان کی اثری تحقیق — سید بشیر محمد
اقبال کا اہم ترین منصوبہ — مظفر حسین
N.C.E.R.T کی کتابوں پر ایک تبصرہ — محمد حمید پانڈے

مقالات
تقویٰ — عزیز احمد ملک فلاحی
تصور آخرت — انسانیت کی معراج — محمد سید عالم فلاحی

سوال و جواب
تحریک اسلامی اور مولانا مودودیؒ — چند اعتراضات کی وضاحت — مولانا جلیل احسن ندوی

شعر و نغمہ
غزلیں — تابش مہدی — عزیز الدین عزیز
قمر الدین قمر

تعارف و تبصرہ
ماہنامہ رہ گزر — ادارہ

جامعہ کے لیل و نہار
تعطیل شش ماہی — ادارہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداریہ

عظیم انسان عظیم کردار

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم سلسلۂ نبوت کی وہ آخری سنہری کڑی ہیں جس کے بعد نبوت کی کوئی کڑی نہیں ہے۔ آپ تاقیامت پیدا ہونے والے تمام انسانوں کے نبی ہیں، رہنمائی اور نجات کے لئے نبی محترم پر ایمان لانا تمام انسانوں کے لئے ضروری ہے۔ اس کے بغیر نجات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

آپ رہبر کامل اور انسان کامل ہیں۔ آپ کی زندگی کے تمام گوشے سورج کی طرح روشن و تابناک اور چاند کی طرح خنک اور ٹھنڈے ہیں۔ آپ ہمارے لئے مکمل نمونہ اور آپ کی زندگی اسوۂ کامل ہے۔ انسانی زندگی کا جو گوشہ بھی آپ کی زندگی کے جس گوشے سے مس ہوتا ہے اس کے اندر ایک طرح کی تابناکی اور دلکشی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اپنے جیسے دوسرے افراد سے ممتاز اور ممیز ہو جاتا ہے۔ قرآن کے الفاظ کتنے شاندار شیریں اور سبک ہیں، وہ کہتا ہے:

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الآخر وذکر اللہ کثیرا۔ (سورۂ احزاب ۲۱)

درحقیقت تم لوگوں کے لئے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے ہر اس شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء کرام تشریف لائے ان کی زندگی، ان کے حالات اور ان کی تعلیمات، بتمام و کمال محفوظ نہیں ہیں۔ ہم صرف ان پہلوؤں کو جانتے ہیں جن سے قرآن بحث کرتا ہے یا جن کا تذکرہ احادیث میں آیا ہے۔ لیکن حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی، آپ کے مکمل حالات اور آپ کی تمام تعلیمات بتمام و کمال محفوظ ہیں۔ ہم آپ کی زندگی کے ایک ایک لمحہ کے بارے میں معلوم کر سکتے ہیں اور جان سکتے ہیں کہ آپ نے انھیں کس طرح گزارا۔ انسانی زندگی کے جتنے پہلو ممکن ہیں اور انسان کی ہدایت، رہنمائی، تربیت و تزکیہ کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے وہ تمام چیزیں آپ کی زندگی میں ہمیں ملیں گی۔

احادیث کی شکل میں آپ کے تمام افعال، اقوال ہمارے پاس موجود ہیں اور آپ کی زندگی ایک رواں دواں قرآن کا

ایک بار کچھ لوگوں نے حضرت عائشہؓ سے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں پوچھا حضرت عائشہؓ نے جواب میں فرمایا: کَانَ خُلُقُ نَبِیِّ اللّٰہِ الْقُرْآن (مسلم) "قرآن میں جن اعلیٰ اخلاقیات کی تعلیم دی گئی ہے وہ سب آپؐ کے اندر پائی جاتی تھیں، آپ ان کا بہترین نمونہ تھے۔"

آپ صلے اللہ علیہ وسلم عظیم کردار کے حامل تھے۔ نبوت سے پہلے بھی آپ کا کردار آئینہ کی طرح صاف و شفاف اور بے داغ تھا اور نبوت کے بعد تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ عرب کے بگڑے ہوئے معاشرے میں جہاں شراب و کباب، رنگ و مستی، لوٹ کھسوٹ، لڑائی جھگڑا، قتل و خونریزی ایک عام سی بات ہو ایک صاف اور پاکیزہ زندگی گزارنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ آپؐ کے اخلاق و کردار کا سکہ بچپن ہی سے لوگوں کے دل پہ بیٹھ گیا تھا۔ اہل مکہ آپ کو صادق و امین کے نام سے پکارنے لگے تھے اور ایک دفعہ جبکہ خانہ کعبہ کی تعمیر جاری تھی، حجر اسود کو نصب کرنے کیلئے جھگڑا ہونے لگا اور قریب تھا کہ تلواریں نیاموں سے باہر آجاتیں کہ ادھر سے آپؐ کا گزر ہوا اور آپؐ نے کمال حکمت و دانائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک چادر میں پتھر کو رکھ دیا اور قبائل کے سرداروں سے کہا کہ اس کو مل کر اٹھائیں۔ پھر آپ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اس کو دیوار میں نصب کر دیا۔

نبوت کے بعد جب آپؐ نے اہل قریش کے سامنے بندگی رب کے پیغام کو رکھا اور ایک خدا، ایک نظام اور ساری انسانیت کی دعوت دی تو آپؐ کے راستے کانٹوں سے بھر دیئے گئے۔ آپ کو پاگل، شاعر، دیوانہ، مجنون کہا گیا اور طرح طرح کی الزام تراشیوں کا نشانہ بنایا گیا لیکن مخالفت کے اس شدید ترین دور میں بھی کسی نے آپؐ کے اخلاق و کردار پر انگلی نہ رکھی۔ ابو جہل جو آپ کا شدید ترین مخالف اور مخالفین کا سرغنہ تھا تاریخ میں اس کی شہادت محفوظ ہے۔ "حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ایک بار حضورؐ کے سب سے بڑے دشمن ابو جہل نے آپؐ سے دوران گفتگو کہا، ہم آپ کو تو جھوٹا نہیں کہتے مگر جو کچھ آپؐ پیش کر رہے ہیں اسے جھوٹ قرار دیتے ہیں۔"

جنگ بدر کے موقع پر اخنس بن شریق نے ابو جہل سے تنہائی میں پوچھا "یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی موجود نہیں ہے سچ سچ بتاؤ تم محمدؐ کو سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا؟ ابو جہل نے جواب دیا، خدا کی قسم محمدؐ ایک سچا آدمی ہے۔ اس نے عمر بھر کبھی جھوٹ نہ بولا لیکن جب سقایت، حجابت اور نبوت سب کچھ بنی قصی ہی کے حصے میں آجائے تو بتاؤ باقی سارے قریش کے پاس کیا رہ گیا۔" ابو جہل کے دل پر حضورؐ کے کردار کا کتنا رعب تھا اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ اراشی نام کا ایک شخص اپنے کچھ اونٹ فروخت کرنے مکہ آیا، ابو جہل نے اونٹوں کا سودا کر لیا اور اونٹ لے گیا مگر قیمت نہیں دی اور مسلسل ٹال مٹول کرتا رہا۔ اراشی بہت پریشان تھا

وہ مختلف عرب سرداروں کے پاس گیا اور ان سے مدد کی درخواست کی مگر ابو جہل کا مقابلہ کرنے کو کوئی تیار نہ ہوا۔ کسی نے ازراہ مذاق اراشی سے کہا کہ محمدؐ کے پاس جاؤ وہ تمہاری قیمت دلا دیں گے۔ واقعی اراشی حضورؐ کے پاس گیا اور پورا واقعہ سنانے کے بعد مدد کی درخواست کی۔ آپؐ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور ابو جہل کے پاس تشریف لے گئے۔ سرداران قریش تماشا دیکھ رہے تھے۔ آپ نے ابو جہل کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ "کون" اندر سے آواز آئی "میں ہوں محمد۔ باہر آؤ۔" آپؐ نے فرمایا۔ اندر سے ابو جہل باہر آیا لیکن اس کا رنگ فق تھا۔ آپ نے فرمایا "اس شخص کو اس کا حق فوراً دے دو۔" ابو جہل اندر گیا اور قیمت لاکر مسافر کے ہاتھ پہ گن کر رکھ دی۔ سرداران قریش ہکا بکا منہ تکتے رہ گئے۔ اور ابو جہل کے آتے ہی اس کا مذاق اڑاتے ہوئے پوچھا "تجھے کیا ہو گیا تھا۔ ہم نے تو ایسا کبھی نہیں دیکھا۔ یہ تو نے کیا کیا؟" ابو جہل نے کہا۔ "کم بختو! جب محمدؐ نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا اور میں نے اس کی آواز سنی تو رعب اور ہیبت سے میری حالت لکڑی کے ایک ٹکڑے کی سی ہو گئی تھی۔"

نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کا اخلاق ایک معجزہ ہے۔ قرآن نے اس کو ایک چیلنج کے ساتھ پیش کیا اور اس کی ان الفاظ میں شہادت دی "اِنَّکَ لَعَلیٰ خُلُقٍ عَظِیْم" (آپ اخلاق و کردار کے عظیم مرتبہ پر فائز ہیں۔)

حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم آہنی عزم اور مضبوط ارادے کے مالک تھے۔ دین کے راستے میں ہر طرح کی مصیبتیں، پریشانیاں اور تکلیفیں آپ نے برداشت کیں لیکن باطل سے ایک لمحہ کیلئے بھی مصالحت نہیں کی اور نہ ہی کوئی کمزوری دکھائی۔ باطل نے بھیس بدل بدل کر بارہا مصالحت کی کوشش کی اور بنیادی اصولوں میں لچکدار رویہ اپنانے کی درخواست کی لیکن آپ نے صاف کہہ دیا کہ اصولوں میں مصالحت اور لچک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تاریخ میں ایک ایسا لمحہ بھی آیا جب بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ حضورؐ کے نہایت شفیق اور مہربان چچا ابو طالب بھی ساتھ چھوڑ دیں گے اور ظاہری سہارے تمام کے تمام یکسر ختم ہو جائیں گے اور آپؐ تحریک اسلامی کی مخالفت کی تیز و تند لہروں میں تن تنہا رہ جائیں گے لیکن آپؐ ایسے نازک وقت میں بھی ثابت قدمی اور عدم مصالحت کا ایسا بے مثال مظاہرہ کیا جو تحریک اسلامی کے کارکنوں کیلئے رہتی دنیا تک مشعل راہ رہیگا اور لوگ ہمیشہ نئی قوت، طاقت اور نیا عزم و حوصلہ پاتے رہینگے۔ سرداران قریش کی اس دھمکی سے متاثر ہو کر کہ "اگر تم نے اپنے بھتیجے کو اس کام سے نہیں روکا تو ہم اسے جان سے مار ڈالیں گے اور تم ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکو گے"، ابو طالب نے کہا: بھتیجے مجھ پر اب زیادہ بار نہ ڈالو، معاملہ اگر اس حد کو پہنچ گیا تو ہم کچھ نہ کر سکیں گے۔ یہ بات سن کر حضورؐ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ آپؐ نے فرمایا: چچا جان! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند لاکر رکھ دیں تب بھی میں اس کام سے نہیں رکوں گا چاہے اس کام میں میری

مولانا جلیل احسن ندوی

مطالعہ قرآن

اعراف ۱۳۰ تا ۱۳۵ انعام ۷۴، ۷۵، ۱۳۰، ۱۳۶

سورۂ اعراف، آیات ۱۳۰ تا ۱۳۵ (وَلَقَدْ اَخَذْنَا .... هُمْ يَنْكُثُوْنَ) کا ترجمہ

"اور ہم نے آلِ فرعون کو قحط سالی اور پیداوار کی کمی میں مبتلا کیا تاکہ ان کو تنبیہ ہو، تو جب خوشحالی آتی، کہتے ہو تو ہے یہ ہمارا حصہ اور اگر ان پر کوئی آفت آتی تو اس کو موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے۔ سن رکھو، ان کی قسمت اللہ ہی کے پاس ہے لیکن ان میں کے اکثر نہیں جانتے، اور کہتے تو تم کیسی ہی نشانی ہمیں مسحور کرنے کے لیے لاؤ، ہم تو تمہاری بات باور کرنے کے نہیں، تو ہم نے ان پر بھیجے طوفان اور ٹڈیاں اور جوئیں اور مینڈک اور خون تفصیل کی ہوئی نشانیاں، تو انھوں نے تکبر کیا اور یہ مجرم لوگ تھے، اور جب آتی ان پر کوئی آفت تو درخواست کرتے کہ اے موسیٰ تم اپنے رب سے اس عہد کے واسطے سے جو اس نے تم سے کر رکھا ہے، ہمارے لیے دعا کرو۔ اگر تم نے یہ آفت دور کر دی تو ہم تمہاری ضرور مان لیں گے اور تمہارے ساتھ بنی اسرائیل کو جانے دیں گے، تو جب ہم ان سے دور کر دیتے آفت کو کچھ مدت کے لیے جس تک وہ پہنچنے والے ہوتے تو وہ دفعتاً عہد توڑ دیتے۔" (تدبر دوم ص ۷۰۸)

مولانا نے "آیاتٍ مُّفَصَّلٰتٍ" کا ترجمہ "تفصیل کی ہوئی نشانیاں" کیا ہے اور تفسیری حصہ میں اس کا مطلب بتایا ہے کہ تورات میں ان معجزات کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، لیکن اس کا مطلب یوں نہیں ہو سکتا کہ یہ سب آفتیں ایک ساتھ نہیں آئیں بلکہ الگ الگ آئیں، کوئی کسی سال، کوئی کسی سال۔

اوپر جو ترجمہ دیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفان اور ٹڈیوں وغیرہ پانچوں آفتوں میں وہ اکڑے رہے، تکذیب کرتے رہے۔ "فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ" وہ اکڑے رہے مجرم بنے رہے، اور آگے جو آیت "لَمَّا وَقَعَ" سے شروع ہو رہی ہے، اس کی تفسیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

لفظ "رجس" کشف کے معنی میں آتا ہے اور آگے آنے والی آیت کا حوالہ دیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ عربی زبان میں رجز۔ کلفا کے معنی میں آتا ہے اور انھوں نے کوئی حوالہ بھی نہیں دیا ہے کہ مراجعت کی جا سکتی۔ انھیں یہ بات احتمالاً کیسے بھی پڑی ہے کہ وہ "الرِّجز" سے اوپر کے عذابوں میں ہر عذاب کو مراد لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات صراحت کے ساتھ بیان ہو چکی ہے کہ ان تمام عذابوں کے وقت وہ اکڑے رہے، ان کی اکڑی ہوئی گردنیں خم نہیں ہوئیں۔ اس کے بعد آتا ہے کہ جب "الرِّجز" ان پر مسلط ہوا تب فرعونیوں نے موسیٰ سے دعا کی درخواست کی اور عہد کیا کہ اسرائیلی مسلمانوں کو چھوڑ دیں گے۔ رجز کے معنی ارتعاش، تحیر، شدید، بھیانک، گھناؤنا کے آتے ہیں، اس سے مراد طاعون ہے۔ اس کا ذکر تورات میں ہے جس کی شکل یہ ہوئی ہے کہ فرعون کی قوم قبطیوں کے تمام گھروں کا پہلا لڑکا طاعون کی زد میں آیا اور اسرائیلی مسلمان طاعون سے بالکل محفوظ رہے۔ جب طاعون سے لوگ مرنے لگے تب اس نے موسیٰ علیہ السلام سے دعا کی درخواست کی اور رہائی کا عہد کیا جس پر وہ قائم نہ رہا۔

سورۂ بنی اسرائیل آیت ۱۰۱ میں ارشاد ہوا ہے کہ "ہم نے موسیٰ کو نو واضح معجزے دیئے"، اس پر یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ نو معجزے کون سے تھے؟ اس کے تعین میں بہت سی رائیں منقول ہوئی ہیں۔ ہمارے نزدیک وہ معجزے یہ ہیں: عَصَا، یدِ بیضا، قحط سالی، طوفان، ٹڈی، جوئیں، مینڈک، خون اور طاعون (رجز)، ان میں پہلے دو معجزے پیغمبر کی سچائی کی دلیل کے طور پر، اور تکذیب کے بعد تنبیہی عذاب کے طور پر پیش آئے، یہ بھی رسالت کی سچائی کی دلیل تھے۔

سورۂ انعام، آیت ۷۴، ۷۵ (وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ .... مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ) کا ترجمہ کیا ہے:

"اور یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا کیا تم بتوں کو معبود بنائے بیٹھے ہو، میں تو تم کو اور تمہاری قوم کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں اور اسی طرح ہم ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی ملکوت الٰہی کا مشاہدہ کراتے تھے تاکہ وہ اپنی قوم پر حجت قائم کرے اور کاملین یقین میں سے بنے۔" (تدبر دوم ص ۴۰۳)

مولانا نے "نُرِيْ" کا ترجمہ "مشاہدہ کرانے" سے کیا ہے۔ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ اس کے معنی "دکھانے" کے بھی آتے ہیں اور بتانے کے بھی آتے ہیں۔ چنانچہ سورۂ نساء آیت ۱۰۵ میں بتانے ہی کے معنی میں آیا ہے، یہ مفہوم مولانا اصلاحی نے "رہنمائی کرنا" بتایا ہے کیونکہ یہاں دکھانے اور مشاہدہ کرانے کے معنی بنتے ہی نہیں۔ جب دوسرے معنی بنتے ہیں تو دکھانے اور مشاہدہ کرانے کی کیا ضرورت ہے۔ مولانا نے ان دونوں کے تفسیری

حصے میں بڑی ہی نفیس بحث کی ہے اور یہ تقریر "مشاہدہ کرانے" پر مبنی ہے۔ اگر کوئی پڑھنا چاہے تو تدبر دوم صفحہ ۴۶۳ تا ۴۶۸ پڑھ لے۔ ہم چند توضیحات پیش کئے دیتے ہیں جو "نُرِیْ" کے معنی جاننے اور سمجھنے پر مبنی ہے۔

آیت ۷۴ میں اَصْنَامًا کا لفظ آیا ہے یہ "صنم" کی جمع ہے جس کا ترجمہ بت اور مورت کرتے ہیں۔ بت اسے کہتے ہیں جسے انسانوں نے بنایا ہو، تراشا ہو۔ وہ خود خالق نہیں ہوتی بلکہ انسانوں کی بنائی ہوئی مخلوق ہوتا ہے، نیز جس کے اندر جان نہیں ہوتی، جو حیات سے محروم ہوتا ہے، جو نطق (گویائی) اور علم و قدرت سے یکسر عاری ہوتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ بڑی بے دانشی اور انسانیت کی توہین ہے کہ انسان اپنی بنائی ہوئی مخلوق کو اپنا الٰہ بنائے جو زندگی سے، گویائی سے، علم اور قدرت سے عاری ہو۔ الٰہ تو وہ ہو سکتا ہے جو خالق ہو، مخلوق نہ ہو، جو زندہ ہو اور زندگی بخش ہو، جو ہمہ گیر علم اور ہمہ گیر قدرت رکھتا ہو۔

اس کے بعد آیت ۷۵ آتی ہے جس کا پہلا لفظ وَکَذٰلِکَ ہے، جس کا ترجمہ "اسی طرح" کیا جاتا ہے، حالانکہ اس کا صحیح ترجمہ "اُسی طرح" ہے۔ اس سے اشارہ ان دلائل کی طرف ہے جو آیت ۷۴ میں ابراہیم علیہ السلام نے یہاں مختصر، مگر جامع انداز میں بت پرستی کے خلاف پیش کی اور جس کی تفصیل سورہ مریم آیات ۴۱ تا ۴۵ میں پیش کی گئی ہے اور جس کی کچھ تھوڑی سی تفصیل اوپر ہم نے دی ہے۔ انہی دلائل کی طرف یہاں ذٰلِکَ سے اشارہ کیا گیا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ جس طرح ہم نے ابراہیمؑ کو بت پرستی کے دلائل سمجھائے اسی طرح ہم انہیں توحید کے دلائل سمجھاتے رہے۔ ہم انہیں بتاتے رہے کہ پوری کائنات پر صرف ہمارا اقتدار قائم ہے، زمین اور آسمانوں پر صرف ہماری حکومت ہے، صرف ہم حکمراں اور متصرف ہیں، اور یہ دلائل ہم بتا رہے تھے تاکہ وہ اپنی مشرک قوم پر اتمام حجت کریں اور تاکہ خود ان کے یقین میں اضافہ ہو۔ قاعدے کی بات ہے کہ داعی توحید جتنی دفعہ توحید کے دلائل لوگوں کے سامنے پیش کرے گا اتنا ہی اس کے اپنے یقین میں اضافہ ہوگا۔ عربی خواں حضرات یہ عربی عبارت ملاحظہ فرمائیں تاکہ مزید انشراح حاصل ہو:

وکذا نری ابراھیم دلائل ابطال الاصنام کذالک نریہ دلائل ملکوت السمٰوٰت والارض لیتم الحجۃ علی قومہ ولیزداد یقیناً۔

اس کے بعد کی آیتوں میں کلدانیوں کے معبودوں کی لغویت واضح کی گئی ہے۔

اوپر ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ یہاں پر یہ باطنی معرفت اور مشاہدہ کی بات نہیں بیان ہو رہی ہے بلکہ منصب نبوت پر فائز ہونے کے بعد خدا کی رہنمائی کا بیان ہے۔ یہاں پر اس

بات کا تذکرہ ہے کہ اللہ عزوجل نے اپنے بندے ابراہیمؑ کو توحید کے دلائل سمجھائے تاکہ اپنی کلدانی قوم پر اتمام حجت کریں۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ان آیتوں (۷۴-۷۵) کا تعلق نبوت سے پہلے کے دور سے نہیں ہے۔

سورہ انعام، آیت ۱۲۸ (وَیَوْمَ یَحْشُرُھُمْ ...... حَکِیْمٌ عَلِیْمٌ) کا ترجمہ مولانا نے یہ کیا ہے:

"اور اس دن کا دھیان کرو جس دن وہ ان سب کو اکٹھا کرے گا، کہے گا اے جنوں کے گروہ تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنایا اور انسانوں میں ان کے ساتھی کہیں گے اے ہمارے رب ہم نے ایک دوسرے کو استعمال کیا اور ہم پہنچ گئے اپنی اس مدت کو جو تو نے ہمارے لئے ٹھہرائی، فرمائے گا تمہارا ٹھکانا اب جہنم ہے، ہمیشہ کے لئے اسی میں رہو، مگر جو اللہ چاہے۔ بے شک تیرا رب حکیم و علیم ہے۔" (تدبر دوم ص ۵۳۸)

اس آیت میں "بعض" کا لفظ دو مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ بعض کا لفظ اگرچہ مبہم ہے لیکن عربی کلام میں آکر یہ مبہم نہیں رہتا بلکہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس "بعض" سے کون مراد ہے اور اس "بعض" سے کون مراد ہے۔ ایسا ہی یہاں پر بھی ہے۔ "بَعْضُنَا" سے مراد جنات ہیں اور "بِبَعْضٍ" سے مراد وہ انسان ہیں جنھوں نے ان جنوں کو اپنا ولی بنایا، ان کو معبود گردانا۔ جب یہ عابدین اور معبودین محشر میں خدا کی عدالت میں پہونچیں گے اور جنوں پر فرد جرم عائد ہوگی اور عائد اس طرح ہوگی کہ پوجنے والے انسان بھی پھنستے نظر آئیں گے تو وہ فوراً بول پڑیں گے کہ اے ہمارے رب! ان جنوں نے ہم کو خوب بے وقوف بنایا، خوب ہم سے اپنی پوجا کروائی، خوب ہم سے نذر و قربانی وصول کی، لہٰذا ہمیں معاف فرما دے اور ان گمراہ اور گمراہ کرنے والے جنوں کو دوہری سزا دے۔ یہ بات واقعہ کے مطابق نہیں ہے کہ یہ لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ اے رب! ہم میں ہر ایک نے دوسرے کو خوب استعمال کیا ہم نے ان سے فائدہ اٹھایا اور انھوں نے ہم سے فائدہ اٹھایا۔ یہ بات محشر میں خدا کی عدالت میں نہ انھوں نے کہی ہے اور نہ کہہ سکتے ہیں۔ بات وہی ٹھیک ہے جو ہم نے کہی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض کا لفظ مبہم ہے لیکن عربی کلام میں جب آتا ہے تو مبہم نہیں رہ جاتا۔ قرآن کے طلبہ کے لئے وَلَا تَتَمَنَّوْا (النساء — ۳۲) اور الرجال (النساء — ۳۴) اور بقرہ، آیت ۲۵۱ (وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ) یہ

تینوں حوالے ان کے امتحان کے لئے کافی ہیں۔

مولانا نے اِلَّا اَن یَّشَاءَ اللّٰہ کا ترجمہ یوں کیا ہے:

" فرمائے گا تمہارا ٹھکانا اب جہنم ہے۔ ہمیشہ کے لئے اس میں رہو مگر جو اللہ چاہے۔"

"مگر جو اللہ چاہے" سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی وقت یہ کافر و مشرک لوگ جہنم سے نکال لئے جائیں گے اور جہنم کی آگ بجھا دی جائے گی۔ یہ شبہ اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ عام طور سے اس کا ترجمہ نحوی قاعدہ کو سامنے رکھ کر نہیں کیا جاتا۔ ہم اس سے پہلے نکات میں کئی جگہ لکھ چکے ہیں کہ یہ الا مستثنیٰ ہے جس کا ترجمہ "لیکن" اور "بلکہ" سے کیا جاتا ہے اس کے بعد آنے والا اسم لفظاً منصوب ہوتا ہے اور محلاً مرفوع ہوتا ہے مبتدا ہونے کی وجہ سے اور خبر بالعموم حذف ہوتی ہے اور کبھی مذکور ہوتی ہے مثلاً سورہ تین میں مذکور ہے اور سورہ عصر میں خبر غائب ہے جو قرینے سے متعین ہو جاتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ الا سے پہلے ایک پورا جملہ حذف ہوتا ہے۔ اسے کھول دیجئے تو ترجمہ یوں بنتا ہے:

"تمہیں ہمیشہ اسی میں رہنا ہے۔ تمہارے بارے میں کسی کی مشیت نہیں چلے گی صرف اللہ کی مشیت چلے گی اور اللہ کی مشیت یہ ہے کہ تمہیں ہمیشہ دوزخ میں رہنا ہے۔"

قرآن مجید میں الا ماشاء اللہ یا الا ان یشاء اللہ جو ہے اپنے پہلے کے مضمون کو وہ اکثر بناتا ہے، اسے مزید پختہ اور مؤکد کرتا ہے۔ سورۂ ہود آیت ۱۰۶ اور ۱۰۷ میں یہی جملہ آیا ہے دونوں جگہ مطلب یہ ہے کہ شرک اور دعوت ہمیشہ جہنم میں رہیں گے، ان کے بارے میں کسی کی مشیت نہیں چلے گی، صرف خدا کی مشیت ہی چلے گی اور اس کی مشیت یہ ہے جو بیان ہوئی کہ تمہیں ہمیشہ کے لئے جلنا ہوگا کوئی تمہیں وہاں نکال نہ سکے گا۔ اسی طرح اہل ایمان کے بارے میں کسی کی مشیت نہیں چلتی کہ کوئی انھیں عطاء ربانی (جنت) سے محروم کر دے۔ اسی طرح حضرت شعیبؑ فرماتے ہیں (اعراف آیت ۸۹) کہ ہم ہدایت کے طالب ہیں جب خدا پر ایمان لائے ہیں پھر کیوں کر ممکن ہے کہ ہم تمہاری ملت شرک میں آ شامل ہوں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

الا ان یشاء اللہ ربنا۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں کسی کو کوئی طاقت نہیں جو توحید سے ہمیں ہٹا کر تمہاری گندی ملت میں ہمیں لے جا شامل کرے صرف خدا کی مشیت ہی نافذ ہوگی اور وہ خوب جانتا ہے کہ ہم ہدایت کے پیاسے ہیں پھر وہ ہمیں ضلالت کے گڑھے میں کیوں پھینکے گا؟

یہ الا مستثنیٰ ہی ہے "کہ اس کے بارے میں علمائے تفسیر یوں کہتے ہیں" ھذا الاستثناء من

احمد الاحسان" مولانا نے اس جملے کے تفسیری حصے میں جو کچھ کہا ہے سے تدبر دوم ص ۵۴۰ پر ملاحظہ فرمائیں۔ انھوں نے اس کو آیات متشابہات میں داخل کیا ہے جو ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا۔

سورۂ انعام آیت ۳۶ (وجعلوا .... ساء ما یحکمون) کا ترجمہ پڑھئے:

" خدا نے جو کھیتی اور چوپائے پیدا کئے اس میں انھوں نے اللہ کا ایک حصہ مقرر کیا ہے، پس کہتے ہیں یہ حصہ تو اللہ کا ہے ان کے گمان کے مطابق اور یہ حصہ ہمارے شرکاء کا ہے۔ تو جو حصہ ان کے شرکاء کا ہے وہ تو اللہ تک نہیں پہنچ سکتا اور جو حصہ اللہ کا ہوتا ہے وہ ان کے شرکاء کو پہنچ سکتا ہے۔ کیا ہی برا فیصلہ ہے جو یہ کر رہے ہیں۔" (تدبر دوم ۔ ص ۵۰۹)

"اس ترجمہ میں شان نزول کی ایک روایت کو آیت کی تفسیر قرار دیتے ہوئے ترجمہ میں "نہیں پہنچ سکتا" اور "پہنچ سکتا ہے" بڑھایا ہے حالانکہ قرآن مجید میں "سکتا" اور "نہیں سکتا" کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ جس شان نزول روایت کو یہ ترجمہ و تفسیر کی بنیاد قرار دیا ہے وہ انھیں کے الفاظ میں یہ ہے:

"اگر کوئی مجبوری پیش آ جائے تو خدا کا حصہ تو ان کے بتوں کی طرف منتقل ہو سکتا تھا لیکن یہ روا نہیں تھی کہ بتوں کا حصہ کسی حال میں خدا کی طرف منتقل ہو سکے..... اگر اتفاق سے کسی بت کے نام کی بکری مر گئی یا چوری ہو گئی یا اس کے نام کا غلہ چوپائے کھا گئے تو اس کی تلافی لازماً خدا کے حصے سے کر دی جاتی اور اگر اسی قسم کی کوئی آفت خدا کے نام پر نکلے ہوئے حصہ پر آ جاتی تو یہ ممکن نہ تھا کہ اس کی تلافی معبودوں کے حصے سے کرنے کی جرات کریں۔" (تدبر دوم ص ۵۴۰)

حیرانی کی بات یہ ہے کہ مولانا نے اپنی تفسیر کی بنیاد براہ راست غور و فکر کو قرار دیا ہے۔ انھوں نے انکار کیا ہے اس بات سے کہ وہ شان نزول کی روایتوں کو قرآن پر حاکم بنائیں۔ لیکن معلوم نہیں کیوں یہاں پر اپنے اصول کی خلاف ورزی کی اور شان نزول کی روایت کو سامنے رکھ کر آیت کی تفسیر فرمائی۔ شان نزول کی روایتوں سے استفادہ تو کرنا ہی چاہئے، لیکن انھیں ہر جگہ آیت کی تفسیر بنا دینا کوئی صحیح طریقہ نہیں۔ اس طرح کی روایت کو مانئے لیکن ہر جگہ آیات کی تفسیر بنانے سے معاملہ قرآن میں شدید رکاوٹ بن جاتا ہے اور بہت سی جگہوں پر آیت کا مطلب خبط ہو جاتا ہے۔ نظم درہم برہم ہو جاتا ہے۔

ممکن ہے عرب مشرکین اس طرح کی حماقتوں میں مبتلا رہے ہوں، اس سے انکار نہیں لیکن کیا ضروری ہے کہ اسے آیت کی تفسیر بنا دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں ان پر جو فرد جرم عائد کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ خود قانون ساز بن بیٹھے ہیں۔ تحلیل و

تحریم کا اختیار انھوں نے خود اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے، حالانکہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینا خاص خدا کا حق ہے۔ عرب مشرکین کا یہ مسلمہ عقیدہ تھا کہ کھیتی، باغ اور مویشی کا پیدا کرنے والا صرف اللہ ہے، ان کے معبودوں کا ان کے پیدا کرنے میں کوئی حصہ نہیں، لیکن قریشی پنڈت ان چیزوں میں کچھ خدا کے نام پر نکالتے اور کچھ معبودوں کے نام پر نکالتے، جو قریش اور دوسرے قبائل کے پنڈتوں کے پیٹ میں جاتا، حالانکہ جب خدا ہی کو ان کا پیدا کرنے والا جانتے تھے تو ان کا فرض تھا کہ خدا ہی سے پوچھتے کہ ہم آپ کی بخشی ہوئی ان نعمتوں کو کس طرح استعمال کریں، پر انھوں نے یہ نہیں کیا بلکہ خود قانون ساز بن بیٹھے۔ "بزعمهم" کا لفظ ان کی قانون سازی پر ایک بلیغ طنز ہے۔ "زعم" کے معنی کوئی بات گھڑنے، کسی چیز کا دعویٰ کرنے کے بھی آتے ہیں، یہاں یہ اسی معنی میں آیا ہے، اور بکثرت اس معنی میں قرآن اور کلام عرب میں استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قانون سازی کا دعویٰ محض جھوٹا دعویٰ ہے اور چونکہ یہ جھوٹے قانون ساز ہیں اس لئے ان کی یہ تقسیم خدا تک نہیں پہنچتی، خدا کے یہاں ان کا یہ عمل مقبول نہیں، جو کچھ یہ خدا کے نام پر نکالتے ہیں وہ بھی خدا تک نہیں پہنچتا۔ کیوں نہیں پہنچتا؟ اس لئے کہ یہ تقسیم خدا کی نہیں ہے، انھوں نے بطور خود کی ہے، اس لئے خدا تک پہنچنے کا، اس کی نظر میں اس کے مقبول ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ فما كان لشركائهم فلا يصل الى الله (وهذا ظاهر) وما كان لله فهو يصل الى شركائهم (لان الله لم يشرع لهم ولم يأذن لهم به) خلاصہ یہ کہ خدا تک وہی عمل پہنچتا ہے جسے خود خدا نے مشروع کیا ہو، جس کے کرنے کی اس کی طرف سے اجازت ملی ہو۔ غیر خدا کی تحلیل و تحریم خدا کی نظر میں غیر مقبول ہے، مردود ہے۔

قرآن

ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کیا ہے اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے؟ شب قدر ہزار مہینوں سے زیادہ بہتر ہے۔ فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کے اذن سے ہر حکم لے کر اترتے ہیں۔ وہ رات سراسر سلامتی ہے طلوع فجر تک۔ (سورۂ قدر)

تحریک اسلامی اور مولانا مودودی کے بارے میں ایک مولانا

"احیائے اسلام نمبر" شائع کرنے کا فیصلہ کرتے ہی یہ خیال بھی آیا کہ اس نمبر کے لئے مولانا جلیل احسن ندویؒ سے ضرور انٹرویو لیا جائے۔ مولانا جلیل احسن صاحب مرحوم و مغفور نہ صرف یہ کہ تحریک اسلامی کے ایک ابتدائی رکن ہیں بلکہ وہ جماعت کے ان ممتاز علماء میں سے ہیں جن کے علم و فکر پر لوگ اعتماد کرتے ہیں، وہ قرآن و عربی ادب میں انہیں بہت اونچا تصور کرتے ہیں۔ جس وقت مولانا منظور صاحب اپنے بعض نجی و مبہم اختلافات کی وجہ سے جماعت سے نکلے تھے اس وقت وہ بریلی سے ماہنامہ "الفرقان" نکالتے تھے اور بریلی ہی میں قیام پذیر تھے۔ ان دنوں مولانا جلیل احسن صاحب مدرسہ مصباح العلوم بریلی میں ادب و انشاء کے استاد تھے۔

ایک عالم دین جو بصورت اشاعت و تبلیغ دین کا فریضہ انجام دے رہے تھے وہ ایک ایسی تحریک میں شامل ہوئے جو اقامت دین ہی کے لئے برپا ہوئی تھی، مگر بہت جلد وہ باہر نکل آئے۔ قدرتی طور پر اس دخول و خروج سے ذہنوں میں زبردست الجھنیں پیدا ہوئیں۔ مگر ایسے ہی دور میں ایک دوسرے عالم دین جو مولانا منظور صاحب سے نجی واقفیت بھی رکھتے تھے، بلکہ ان کے علم و فضل کے قائل بھی تھے، جماعت اسلامی میں شامل ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ انقلابی فیصلہ اور غیر معمولی اقدام یقیناً اکثر لوگوں کے لئے حیرت و تجسس کا باعث ہو سکتا ہے جب کہ باہر آنے والے بزرگ بھی ایک اچھے عالم دین ہیں اور دین کی اشاعت و تبلیغ ہی کی خاطر ایک دینی ماہنامہ نکال رہے ہیں، اور دوسری طرف ٹھیک اسی موڑ پر جماعت میں داخل ہونے والے بھی ایک اچھے عالم دین ہی ہیں جو دینیات سے شغف رکھنے کے علاوہ قرآن و سنت پر اچھی اور گہری نگاہ بھی رکھتے ہیں۔

اسی تلاش و جستجو اور حقیقت حال کی وضاحت کی خاطر ہم نے ایک تفصیلی سوالنامہ مرتب کیا اور مولانا جلیل احسن صاحب کی خدمت میں بھیج کر ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے قلم سے ان سوالات کے جوابات تحریر فرمائیں۔ مولانا کے ان جوابات سے بجا طور پر یہ توقع ہے کہ بہت سی تاریخی معلومات اور تحریکی معاملات پر سے پردہ اٹھے گا اور وہ اہم اور فیصلہ کن وجوہ و اسباب بھی سامنے آسکیں گے جن کے پیش نظر ایک عالم دین نے دینداری کی زندگی گزارنے اور قرآن و سنت کا درس دیتے رہنے کے باوجود اپنے لئے لازم یہ سمجھا کہ تحریک اسلامی میں

شامل ہوں، ان وجوہ اور اسباب کی وضاحت نہ صرف کارکنانِ تحریکِ اسلامی کے لئے اطمینانِ قلب کا باعث ہوگی بلکہ عام مسلمانوں کی آنکھیں کھولنے کے لئے بھی انشاء اللہ یہ وضاحت انتہائی مؤثر ہوگی۔

سوالات پہنچنے کے بعد مولانا مرحوم نے جوابات لکھنے کا وعدہ تو فرما لیا لیکن انہی دنوں ان کے پاؤں میں پھوڑا نکل آیا۔ وہ معذور تو تھے ہی، پھوڑے کی غیر معمولی تکلیف نے انہیں اور زیادہ معذور کر دیا۔ عذر واقعی اور صاف تھا، اس کے لئے زیادہ اصرار کی جرأت نہ ہوئی، پھر جب تندرست ہو گئے تو اصرار کیا مگر تاخیر ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ ذکریٰ کا "احیائے اسلام نمبر" شائع ہو گیا۔ مولانا نے احیائے اسلام کی اشاعت کی خبر سن کر اطمینان کا سانس لیا۔ مولانا نے لکھا کہ جوابات تو میں نے مرتب کر لئے ہیں لیکن اب تو سب کچھ بعد از وقت ہے۔ تمہارا نمبر شائع ہو چکا۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں مولانا مغفور ابھی اس کاوش کو ضائع نہ کر دیں۔ اس لئے فوراً ہی خط لکھا کہ ابھی زحمت نہ ہو، رجسٹرڈ ڈاک سے اپنے جوابات میرے پاس بھیج دیجئے۔ ان کی قدر و قیمت اب بھی اسی قدر ہے۔ میرے پاس کچھ اور اہم مقالات بھی ہیں اور آپ کی یہ نگارش بھی نہایت اہم اور ایک تاریخی دستاویز ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ احیائے اسلام نمبر ۲ بھی شائع کریں گے اور اس میں آپ کی یہ اہم تحریر اہمیت کے ساتھ شامل کی جائے گی۔ مولانا مرحوم نے کسی پس و پیش کے بغیر فوراً ہی اپنی وہ تحریر روانہ فرما دی مگر بعد ہی پھر تاکیدی خط آیا کہ مجھے کچھ اضافے کرنے ہیں۔ واپس بھیج دو۔ تحریر واپس کر دی گئی۔ مولانا مرحوم نے کچھ اضافے کئے اور تحریر واپس فرما دی۔ کچھ دنوں بعد الگ سے مزید کچھ اضافے ارسال فرمائے اور اب مولانا مغفور کی یہ تحریر اپنی آخری شکل میں ناظرین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

مولانا مرحوم و مغفور کے ان قیمتی جوابات سے بہت سے حق پسندوں کی خلش دور ہوگی جو اس دور کے مبہم شبہات کی وجہ سے خواہ مخواہ ذہنی الجھنوں میں مبتلا رہے ہیں۔ تحریکِ اسلامی کے لئے بہت سے دوستوں کے دل کھلیں گے اور وہ اس راہ میں آگے بڑھیں گے۔ بہت سے سربستہ راز بے نقاب ہوں گے جن کی وجہ سے خواہ مخواہ بہت سے لوگ غلط فہمیوں کا شکار ہوئے اور ہو سکتے ہیں، اور خود کارکنانِ تحریکِ اسلامی مولانا مرحوم کے ان ارشادات میں اپنے لئے عزم و ثبات کا سامان، سرگرمی اور روح کی گرمی کے زبردست محرکات پائیں گے اور انشاء اللہ تحریک کے مخلص کارکنوں کے لئے اپنے تحریکی سفر میں بہترین زادِ راہ میسر آئے گا۔

ذیل میں ہم پہلے وہ سوالات پیش کر رہے ہیں، اور اس کے بعد مولانا مغفور کے قیمتی جوابات۔ ہمیں توقع ہے کہ آپ یہ جوابات توجہ اور دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے اور مولانا مرحوم کا اپنے اوپر یہ حق سمجھیں گے کہ

آپ دل کی گہرائیوں سے ان کے لئے مغفرت کی دعائیں کریں۔

کیا خبر تھی کہ مولانا کی زندگی میں ان کی یہ تاریخی دستاویز شائع نہ ہو سکے گی اور وہ اپنی آنکھوں سے اس تاریخی نگارش کو چھپا ہوا نہ دیکھ سکیں گے۔ موت کا وقت مقرر ہے اور وہی وقت درحقیقت اس کی رخصت کا صحیح وقت ہے، مگر انسانی آرزو بھی عجب ہے۔ ہم تو یہی سوچتے ہیں کاش مولانا حیات ہوتے اور ان کی زندگی میں ان کی یہ تحریر سامنے آتی۔

(محمد یوسف اصلاحی)

سوالات

(۱) جب آپ نے سنا کہ مولانا مودودیؒ نے ایک دینی تحریک برپا کی ہے تو ایک عالمِ دین ہونے کی حیثیت سے اس تحریک اور برپا کرنے والے کی صداقت و حقانیت کے لئے آپ نے کن کن چیزوں سے متعلق اطمینان کر لینے کی ضرورت محسوس کی، اور یہ اطمینان حاصل کرنے میں آپ کو کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی؟

(۲) دیوبند میں وقت کے مستند علماء سے دینی علوم پڑھنے نیز خود دیندارانہ زندگی گزارنے اور دینی علوم کا درس دیتے رہنے کے باوجود کس چیز نے آپ کو مجبور کیا کہ آپ اسلامی دینی تحریک کے بارے میں غور و فکر کریں اور آخر کار اس سے وابستہ ہو جائیں؟

(۳) عام علماء کی کوشش و کاوش اور مسلم تنظیموں کی موجودگی میں آخر وہ کون سی کمی تھی جس کے لئے جماعتِ اسلامی کی تشکیل ناگزیر تھی، اور وہ کون سی اہم بات تھی جس نے جماعتِ اسلامی کی تشکیل کو وجہِ جواز بنایا۔

(۴) جماعتِ اسلامی کا وہ کون سا فکری اور عملی امتیاز تھا جس نے آپ کو مجبور کیا کہ نہ صرف آپ خود اس سے وابستہ ہو جائیں بلکہ اپنے حلقۂ کار میں دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیں؟

(۵) وقت کے اونچے علمائے دین سے درس لینے، مولانا اختر احسن اصلاحیؒ جیسے بے بدل معلمِ قرآن سے استفادہ کرنے، عرصۂ دراز سے قرآن پر غور و فکر کرنے اور ایک زمانے سے معلمِ قرآن ہونے کی حیثیت سے آپ کی ماہرانہ رائے اس بارے میں کیا ہے کہ:

دورِ حاضر میں تفہیم القرآن کی تفسیری حیثیت و مقام کیا ہے؟

عہدِ حاضر کی دوسری اردو تفسیروں کے مقابلے اس کا رول کیا رہا ہے؟

اور تحریکِ اسلامی کی سرگرمیوں کو نکھارنے، بڑھانے میں اس کا کیا حصہ رہا ہے؟

کیا علماء اور عربی تفاسیر سے استفادہ کر سکنے والے اہل علم حضرات بے نیازی دکھانے میں حق بجانب ہیں؟

(۶) آپ علوم دینیہ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ پچھلی تقریباً نصف صدی سے دینی علوم پڑھاتے رہے ہیں۔ کیا آپ کے نزدیک بھی مولانا مودودیؒ کے اردو لٹریچر کی کوئی اہمیت ہے؟ کیا اس لٹریچر نے آپ کو بھی متاثر کیا ہے؟ — سب سے زیادہ انقلابی، مفید اور مؤثر کتاب آپ کے نزدیک کون سی ہے۔ کیا آپ کو کسی خاص کتاب نے متاثر کیا ہے یا محض اس صدا نے کہ ایک شخص نے دین کی اقامت کے لیے ایک تحریک برپا کی ہے؟

(۷) دینی علوم کی تکمیل کرنے اور دینی علوم پڑھانے کے باوجود کیا آپ نے یہ محسوس کیا کہ کوئی کمی ہے جس کو مودودیؒ صاحب نے پورا کیا ہے۔ اگر آپ کو کوئی خلا نظر آیا تھا جس کو مودودی صاحبؒ نے اپنے فکر سے پورا کیا ہے تو اس پر مفصل روشنی ڈالئے۔

(۸) مولانا مودودیؒ کی وہ کون سی قائدانہ امتیازی خوبی ہے جس نے قدرتی طور پر ان کو عالمی اسلامی تحریک کا قائد اور وقت کے قائدین کا قائد بنا دیا۔

(۹) مولانا مودودیؒ کے ساتھ رہنے کا بھی آپ کو اتفاق رہا۔ مولانا مودودیؒ کا سلوک اپنے رفقاء کے ساتھ کیسا تھا۔ وہ کس حد تک اپنے رفقاء کے جذبات و احساسات کا لحاظ رکھتے تھے۔ کیا ان سے قریب تر رہنے والے ان کے گرویدہ ہوتے چلے جاتے تھے یا ان کی عقیدت قریب ہو کر کافور ہو جاتی تھی؟

(محمد یوسف اصلاحی)

بقیہ: ..... تصورِ آخرت .....

خدا کی اس زمین پر اشرف مخلوقات بن کر نہیں ارذل المخلوقات بن کر رہنا پسند کرتے ہیں۔ وہ پیٹ کے پجاری بن کر آدمیت کی تمام حدود کو پھاند جاتے ہیں اور انہیں کبھی بھی اس چند روزہ زندگی میں من شانتی کی دولت میسر نہیں ہوتی۔ عدل و انصاف کی کوئی کرن ان کی تاریک زندگیوں کو منور نہیں کرتی۔ اس کے برعکس تصورِ آخرت انسان کو پیام مسرت دیتا ہے: اُسے دوسروں کے حقوق و مفادات کا محافظ و نگہبان بنا دیتا ہے، اخوت و محبت کی روحانی شراب نصیب ہوتی ہے، اس کی زندگی شفقت و محبت اور مودت و اخوت کی ترجمان بن جاتی ہے، احترام انسانیت کا تاج اس کے سر پہ رکھا جاتا ہے اور نتیجتاً دونوں جہان کی فلاح و کامرانی اس کے قدم چوم لیتی ہے۔

تحریکِ اسلامی اور مولانا مودودیؒ

چند تاثرات اور توضیحات

(از مولانا جلیل احسن ندوی)

برادر عزیز و مکرم مولانا محمد یوسف اصلاحی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا بہت مفصل اور جامع سوالنامہ ملا اور پھر بار بار اصرار و تسلسل کے ساتھ یاد دہانیاں ملیں مگر مجھے صحت و قوت حاصل ہوتی تو آپ کو یاد دہانی کی ضرورت نہ ہوتی اور نہ تاخیر پر مجھے شرمساری ہوتی۔

آپ کے نمبروار سوالات کی میں پابندی نہ کروں گا، البتہ یہ کوشش کروں گا کہ آپ جو کچھ جاننا چاہتے ہیں اس مختصر تحریر میں وہ سب کچھ آ جائے۔

آپ کو معلوم ہے کہ میری ساری تعلیم مدارس نظامیہ میں ہوئی ہے۔ میرے تمام اساتذہ یا تو قاسمی ہیں یا مظاہری، اور آخر میں چند ندوی۔ ان میں سے بیشتر انگریزوں کے خلاف لڑی جانے والی جنگ آزادی سے وابستہ تھے جس کی قیادت انڈین نیشنل کانگریس کر رہی تھی۔ ہمارے یہ شیوخ ہم سے کہتے تھے کہ یہ جنگ آزادی ایک مقدس اسلامی فریضہ ہے۔ پہلے انگریزی تسلط ختم کرو پھر اسلام کی حکومت قائم ہوگی۔ کس طرح اسلام کی حکومت قائم ہوگی، اس کے قیام کا طریقہ کیا ہوگا، وہ فرماتے نقشہ بعد میں تیار ہو جائے گا۔ پہلے انگریز تو ہٹے۔ میں اپنے دل میں خلش لئے خاموش ہو جاتا، ان سے بحث نہ کرتا۔ میرے اندر خلش کا آغاز قدوری میں قضاء کے باب سے ہوا۔ معلوم ہوا کہ اسلام میں عدلیہ کا نظام موجود ہے۔ اگر اسلام کا نظام عدل قائم نہیں ہے تو اس طرح کے ابواب کیوں پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں۔ پھر ہدایہ اور احادیث کی کتابوں میں امارت، امیر و ماموم کے حقوق و فرائض اور حدود و تعزیرات وغیرہ نے خلش اور بڑھا دی۔ اپنے مشیوخ سے بہت زیادہ محبت و عقیدت کے باوجود مجھ میں ذرا آگہی ان حضرات کی تمام تر جدوجہد کا رخ کسی اور طرف ہے۔ پھر انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ان کا رخ اچانک کدھر کی طرف کس طرح ہو جائے گا۔ جس گروہ کی قیادت میں یہ لوگ کام کر رہے ہیں اس کا ہدف تو وہ نہیں ہے جو ہمارے

حضرت جانتے ہیں "متحدہ قومیت" کا لفظ دونوں بولتے ہیں لیکن دونوں کے تصورات و مفاہیم ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ان میں جو لوگ قیادت کے منصب پر فائز ہیں لازماً انہی کے تصورات عام ذہنوں پر چھا جائیں گے۔ پھر اسلام کے قائم ہونے کا سوال ہی سرے سے خارج از بحث ہوگا۔

کبھی خیال آتا کہ ہمارے اپنے حضرات کے ذہنوں میں اسلام کے جامع نظام کا تصور ہی نہیں ہے، کچھ منتشر اور متفرق معلومات کے ذخائر ہی ان کے پاس ہیں مگر حقیقت اس خیال کو رد کر دیتی ہے۔ کبھی یہ رائے قائم ہوتی کہ ان کے ذہنوں میں اسلام کا جامع تصور تو ہے مگر کسی وجہ سے پورے اسلام کی دعوت لے کر اٹھنے کی ہمت نہیں کر پاتے۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کس طرح اس ملک میں اسلام کی دعوت اٹھائی جائے۔ اس کا نقشہ اور پروگرام کیا ہو۔

اس موقع پر جی چاہتا ہے کہ بزرگوں کے کچھ اقتباسات پیش کر دیئے جائیں، جن سے حضرات علماء کی حیرانی اور درماندگی کا انکشاف ہوتا ہے۔ جناب مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے "اسلام کا اقتصادی نظام" نامی کتاب لکھی جس میں اسلام کے نظام معیشت پر بہت سا تحقیقی مواد جمع کیا تھا لیکن آخر میں لکھا کہ یہ معاشی انقلاب، دو نظریوں میں سے ایک نظریہ ہی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے۔ ایک خالص اسلامی نظریہ، دوسرا اشتراکی نظریہ، اس کے بعد اذعانی انداز میں فرماتے ہیں:

"بلا خوف لومۃ لائم، اسلامی بصیرت کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ ملک میں سر دست پہلا نظریہ یعنی اسلامی نظریہ جامۂ عمل نہیں پہن سکتا بلکہ دوسرا نظریہ ہی (اشتراکی نظریہ معاشیات) عملاً متوقع ہے۔"

حضرت مولانا مفتی کفایت اللہؒ کا یہ ارشاد ملاحظہ فرمائیے:

"مولانا مودودی کی تحریرات بیشتر صحیح ہیں اور ان کی تحریک میں نظری طور پر کوئی غلطی اور گمراہی نہیں ہے۔ صرف یہ بات قابل غور ہے کہ موجودہ دور میں اس تحریک کے مفید اور بار آور ہونے کے لئے ظروف مساعد ہیں یا نہیں اور یہ کہ محرک صاحب حال ہے یا صرف صاحب قال۔"

اور حضرت مولانا مدنیؒ فرماتے ہیں:

"مولانا مودودی کا لٹریچر بہت سی تحریروں اور رسالوں وغیرہ میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ مجھ کو اس قدر فرصت نہیں کہ بالاستیعاب دیکھوں، جس قدر مضامین نظر سے گزرے ہیں حالات موجودہ میں ناقابل عمل ہیں واللہ اعلم۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ موجودہ دور میں اور اس ماحول میں کیا شرعی تکلیف ہم پر ان امور

حسب تصریحات ہوتی ہیں یا نہیں۔ جمعیۃ العلماء نے جو طریقہ سیاست میں اختیار کیا ہے وہ حسب استطاعت أَهْوَنُ الْبَلِيَّتَيْن کی بنا پر کیا ہے۔ موجودہ گورنمنٹ میں جو طاقت و قوت موجود ہے اسی پر ان کی حرکت و سکون کا مدار ہے۔ مودودی صاحب جو فلسفہ پیش فرما رہے ہیں اسے دیکھنے اور اس پر تنقید و تبصرہ کرنے یا اس کا جواب لکھنے کی ضرورت ہماری سمجھ میں نہیں آتی، اگر آتی بھی تو فرصت نہیں۔ مودودی صاحب اور ان کے متفقین اپنے عمل کو حرکت میں لائیں، ہم ان کا مقابلہ نہیں کریں گے۔ اگر ہماری سمجھ میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے وہی عمل شرعی اور مفید سمجھ میں آ گیا تو ہم بھی متبع بن جائیں گے ورنہ حسب قاعدۂ شرعیہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ

بلا خوف لومۃ لائم اسلامی بصیرت کے ساتھ یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ ملک میں سر دست پہلا نظریہ یعنی اسلامی نظریہ جامۂ عمل نہیں پہن سکتا بلکہ دوسرا نظریہ ہی (اشتراکی نظریہ معاشیات) عملاً متوقع ہے

نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ہم معذور ہوں گے۔"

اسی سیاق میں مزید ارشاد فرماتے ہیں:

"بہت سے اجتماعی احکام شریعت ایسے بھی ہیں جو کہ صرف اسلامی بادشاہت پر موقوف رکھے گئے ہیں جن کے مخاطب افراد نہیں ہیں بلکہ سلاطین اور خلفائے اسلام ہیں۔ جب سلطنت حاصل نہ ہو، افراد و آحاد کو ان پر عمل کرنا نہ لازم ہوگا نہ مباح۔ ایسی حالت میں آحاد کا فریضہ صرف یہ ہوگا کہ وہ حسب استطاعت صرف اس کی جد و جہد کریں کہ اسلامی حکومت قائم ہو۔"

تینوں بزرگوں کے یہ اقتباس ہم نے رد و تبصرہ کے لئے پیش نہیں کئے ہیں، اگرچہ ان پر گفتگو کی بڑی گنجائش ہے، بلکہ صرف یہ بتلانے کے لئے پیش کئے ہیں کہ ہمارے پیشوایان امت اسلامی دعوت برپا کرنے کی ہمت نہیں پا رہے تھے۔ حالات و ظروف کی "مساعدت" کی وجہ سے جب کہ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہ امت کا فریضہ ہے کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی جد و جہد کرے۔ ایسی حالت میں اگر اللہ نے اپنے بندوں میں سے ایک بندے کو اس فریضہ کے لئے اٹھنے کی توفیق دی جو "نہ" علماء سے تھا، کوئی "مسٹر" نہ تھا، وہ عربی کا عالم تھا، کتاب و سنت کا گہرا علم رکھتا تھا۔ اگر حضرت علماء کا سر فخر سے اونچا ہوتا کہ ہم ہی میں سے ایک فرد کو فرض کی ادائیگی کے لئے توفیق ملی، اس کی قیادت قبول نہ کرتے تو کم از کم مشفقانہ دعاؤں ہی کا تو مستحق

جاتے ہیں۔ سب سے پہلے تو انھوں نے زمرۂ علماء سے خارج کرنے کے لئے پوری قوت صرف کی پھر وہ کچھ کیا جو سب کو معلوم ہے۔ یہ جگر خراش کہانی سنانے کی گنجائش اس تحریر میں نہیں۔

(۲) آپ جانتے ہیں کہ مدارس نظامیہ میں دینی کتابیں۔ کچھ کچی پکی، کچھ مفید اور کچھ مضر پڑھائی جاتی تھیں اور اب بھی ان مدارس میں اس پہلو سے کچھ زیادہ اصلاحات نہیں ہوئی ہیں۔ اب بھی یہ لوگ نفحۃ الیمن سے اور مقامات حریری سے چمٹے ہوئے ہیں جو "ادبی" نہیں مکمل طور پر "غیر ادبی" ہیں۔ غیر عربی انشاء و ترجمہ کا بالکل رواج نہ تھا، اپنی اسی کمزوری کی تلافی کے لئے میں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کا رخ کیا، یہاں پر طلبہ

مولانا مودودیؒ کی تحریرات بیشتر صحیح ہیں اور ان کی تحریک میں نظری طور پر کوئی غلطی اور گمراہی نہیں ہے صرف یہ بات محل غور ہے کہ موجودہ دور میں اس تحریک کے مفید اور بار آور ہونے کیلئے ظروف مساعد ہیں یا نہیں، اور یہ کہ محرک صاحب حال ہے یا صرف صاحب قال۔

کی انجمن جمعیۃ الاصلاح میں بہت سے پرچے آیا کرتے، ہفت روزہ اردو عربی وغیرہ آتے۔ الاصلاح کی میز پر پہلی دفعہ ترجمان القرآن پر نظر پڑی اور مولانا مودودیؒ کا غائبانہ تعارف حاصل ہوا۔ ترجمان آتا رہا پڑھتے رہے اور متاثر ہوتے رہے، اسی دور میں سیاسی کشمکش حصہ دوم پڑھنے کو ملی جس سے اندازہ ہوا کہ ہندوستانی مسلمان کس عظیم خطرے سے دوچار ہیں۔ پھر رسالہ متحدہ قومیت دیکھا جس سے اندازہ ہوا کہ ہمارے شیوخ کے سوچنے اور کرنے کا رخ صحیح نہیں ہے، لیکن عقیدت اپنی جگہ قائم رہی اور اب بھی ان کی چند خوبیوں کی وجہ سے قائم ہے لیکن اندھی عقیدت کے جو معنی ہیں اسے نہیں سمجھ سکتے۔ اپنا حال تو بقول حماسی یہ ہے، لیکن

اُمْرِیٌّ تُشْعَبُ مِنَ الْقَلْبِ خَارِجٌ -

(۳) بریلی کی معلمی کے زمانے میں اپنا "ترجمان" آتا رہا، پڑھتے اور متاثر ہوتے رہے، جماعت اسلامی قائم ہوچکی تھی اور جناب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کا قیام وہیں تھا۔ وہ الفرقان کے ذریعہ جماعت اسلامی کی دعوت پورے زور اور جوش کے ساتھ پیش کرتے تھے اور وہ اس منطقہ کے جماعتی ذمہ دار بھی تھے۔ اگر حادثہ خروج پیش نہ آتا تو ہم انہی کے ہاتھ پر بیعت کرتے۔

(۴) اطلاع ملی کہ مولانا نعمانی صاحب مرکز دعوت، دارالاسلام پٹھان کوٹ کی طرف مستقل طور پر

ہجرت کر رہے ہیں۔ شہر کے تمام اہلسنت والجماعت تحقیق نہیں۔ یہ بات مشہور تھی کہ مولانا کی یہ ہجرت الی اللہ والی ہجرت ہے، اب وہیں سے دعوت اسلامی کا کام کریں گے۔ ہم لوگوں کو تعلق خاطر تھا کہ وہ دیکھنے کے لئے جا رہے ہیں اور اس کے لئے مرکز کو بھی چلے ہیں۔

(۵) پھر اطلاع ملی کہ مودودی صاحب اور منطقائی ذمہ داروں کے درمیان اختلاف رونما ہو گیا ہے اور اختلاف شدید ہے۔ اسی کی وجہ سے دہلی میں ارکان کا اجتماع منعقد ہونے جا رہا ہے، مولانا پٹھان کوٹ سے واپس آچکے تھے، سنبھل میں بیمار تھے، شدید بخار کی حالت میں دہلی اجتماع میں شریک ہوئے۔ مولانا کی رائے یہ تھی کہ مودودی صاحب جماعتی امارت کے اہل نہیں ہیں اس لئے جماعت کی موجودہ حیثیت باقی نہ رہے بلکہ کئی جماعت اسلامی ہیں اور منطقائی ذمہ دار مستقل امیر ہو جائیں اور سال میں دو تین بار کسی جگہ مل بیٹھ کر مشترک امور طے کریں، یہ گویا ایک فیڈرل (وفاقی) قسم کی جماعت اسلامی ہے۔ مولانا مودودیؒ اس تجویز سے واقف تھے، انھوں نے دہلی اجتماع میں سب تجویزیں رکھ دیں۔ وہ خود اس دعوت و تنظیم کے بانی تھے وہ امارت سے مستعفی دے سکتے تھے مگر دعوت الی اللہ کا کام بند ہو جائے یہ ان کی برداشت سے باہر کی بات تھی۔ انھوں نے متبادل بھی سب تجویزیں مجلس کے سامنے رکھ دیں۔ ان میں وہ تجویز بھی تھی جسے آپ نعمانی تجویز کہہ سکتے ہیں۔ بحث و مباحثہ کے بعد طے ہوا کہ تین سال کے بعد دعوت الی اللہ کے کام کا آغاز ہو، ہے دعوت ایک رہے گی اور جماعت بھی ایک ہی رہے گی اور اس کے امیر مودودی ہی رہیں گے۔ پس جن لوگوں کو ان کی امارت پر اعتماد نہ ہو وہ استعفیٰ دے دیں، چنانچہ لوگوں نے استعفیٰ دے دیا۔ انہی میں مولانا نعمانی بھی تھے۔

(۶) اس کے بعد مولانا بریلی تشریف فرما ہوئے اور مشہور ہوا کہ مولانا نے جماعت سے علیحدگی اختیار کرلی اور یہ اطلاع بھی ہم تک پہنچی کہ مودودی صاحب امامت کے اہل نہیں ہیں کیونکہ وہ نماز کے معاملے میں بے پرواہ اور سست کار ہیں، صبح کی نماز اکثر قضا ہو جاتی ہے، دن چڑھے اٹھتے ہیں۔ یہ سن کر مجھے بڑی تشویش ہوئی کہ "پھر تو" کہ دعوت تمام خود ہوشد" اس لئے مولانا حامد کو اپنے ساتھ لے کر مولانا کی قیام گاہ پر پہنچا اور دریافت کیا، تو جہاں تک مجھے یاد ہے کہ مولانا نے ذرا سی توقف کے استغفراللہ پڑھتے ہوئے فرمایا یہ محض افترا پردازی ہے۔ مولانا مودودیؒ تو پانچوں نمازوں کی امامت کرتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے وقت پر نہ پہنچ سکنے کا انھیں اندیشہ ہوتا ہے

کسی دوسرے کو امامت کے لیے کھڑا کر دیتے ہیں، اور پھر فرمایا جتنے سکونِ قلب سے وہ نماز پڑھتے ہیں کم ہی لوگوں کو اتنے سکون سے نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ اور قرآن تو اتنا ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے ہیں کہ اگر میں اتنا ٹھہر کر پڑھوں تو سورۂ فاتحہ میں بھی بھول جاؤں۔ اس پر مولانا عابد نے پوچھا پھر آپ جماعت سے کیوں نکلے، میں نے انھیں روکا کہ آپ جس چیز کا اعلان کرنے آئے تھے وہ سن لیا، اٹھو، چلو۔ چنانچہ ہم اپنی قیام گاہ آگئے اور پھر جماعت میں شمولیت کی درخواست مرکز بھیج دی۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ مودودی صاحب سے سخت اختلاف کے باوجود اور جماعت سے نکلنے کے بعد مودودی صاحب کی نماز اور قرآن کی "شہادتِ حق" سن کر مولانا نعمانی کی قدر و منزلت اور محبت بڑھ گئی۔ علیحدگی کے بعد تو نعمانی کی نفسیات یہ ہو گئی ہے کہ اپنے مخالف کے بارے میں یا تو "شہادتِ زور" دیتا ہے یا کفِ لسان کرتا ہے گول مول بات کرتا ہے یا پھر الٹی شہادت دیتا ہے۔

(۷) مولانا نعمانی صاحب جب دارالاسلام تشریف لے جارہے تھے تو میرے پوچھنے پر ان کے بعض واقف کار لوگوں نے بتایا کہ اب "الفرقان" دارالاسلام ہی سے شائع ہوگا۔ اور جب مولانا وہاں پہنچے تو وہاں پہلے سے ایک فتنہ باز صاحب موجود تھے جو بڑے چرب زبان اور چھچھورے، گفتگو کے ماہر اور بعض نا گفتنی وجوہ سے مودودی صاحب کے شدید مخالف اپنا دار کرکے رہنے والے۔ انھوں نے مولانا نعمانی کے گرد گھیرا ڈالنا شروع کیا اور مولانا بڑے سادہ دل یا کسی کی بات سے جلد متاثر ہونے والے، بالخصوص جب کہ وہ رفیقِ راہ بھی ہے اور جماعتی اہم عہدہ پر فائز۔ انھوں نے مولانا کو بتایا کہ مودودی صاحب کی زندگی عیاشانہ زندگی ہے۔ چاندی کا پاندان رکھتے اور استعمال کرتے ہیں، گھر میں قدِ آدم آئینہ رکھتے ہیں، بیوی کو بے پردہ سیر و تفریح کراتے ہیں اور ادھر مولانا کی رگ تو یہ رہی تھی کہ جب انھوں نے "الفرقان" وہاں سے نکالنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تو مودودی صاحب نے کہا کہ یہاں سے جو دعوت کے ترجمان پرچے کا نکلنا سمجھ میں نہیں آتا، الفرقان ہی کو کیوں نہ جماعت کا نقیب بنا دیا جائے لیکن دوسرے مشورہ کار اس کے لیے تیار نہ ہوئے۔ مولانا نے ایک تجویز یہ رکھی کہ لوگوں کو تہجد کا پابند بنایا جائے۔ مولانا مودودی صاحب نے کہا پابندی لگانا تو صحیح نہیں ہے البتہ آپ اور میں دونوں تشویق و ترغیب کا کام کریں۔ انھوں نے ذکر و اذکار کی پابندی کی بات رکھی جو رد ہو گئی۔ وہی جواب ملا جو تہجد والی تجویز پر ملا۔ مولانا کی تربیت اکی طرح کے مرشدوں کے زیر سایہ ہوئی تھی۔ غرض ان باتوں کی وجہ سے دھکا لگا، ادھر مسلسل "بنارسی انگشتی"

مولانا کو تنگ رہتے تھے۔ غرض بہت سے وجوہ کی بنا پر بالآخر علیحدگی عمل میں آئی اور اب ان کا جو موقف ہے وہ آپ کو بھی معلوم ہے اور دوسرے بھی جانتے ہیں۔ اس موقع پر مولانا سے درخواست کرنے کو جی چاہتا ہے کہ مودودی صاحب کا جواب تو شائع ہو چکا ہے آپ کا اپنا خط بنام مودودی بھی شائع ہو جانا چاہیے اور وہ طویل مراسلت بھی جو آپ اور مولانا مسعود عالم کے درمیان ہوئی وہ بھی شائع فرما دیں۔ اس سے قارئین کو اصل حقیقت تک پہنچنے میں بڑی مدد ملے گی۔ رہی مودودی صاحب کی عیاشانہ زندگی، تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ حیدرآباد کی آٹھ سو روپے کی پیش کش ٹھکرا کر پٹھان کوٹ کے ویرانے میں آئے تھے۔ کیا عیاش آدمی یہی کرتا ہے جو مودودی صاحب نے کیا؟ یہ بھی معلوم ہے کہ حیدرآباد میں ان کا ماہانہ خرچ تقریباً چودہ سو روپے ماہانہ تھا اور دعوت الی اللہ کی محبت میں دارالاسلام میں ماہانہ خرچ ایک سو میں روپیہ رہ گیا تھا۔ کیا ہمارے دینی دور کے مشائخ ایک دم اپنے کو اتنا نیچے لا سکتے ہیں؟ ان کا پاندان والا ہم نے بھی دیکھا ہے۔ مراد آبادی تھا۔ البتہ بیوی کو پاندان خاص چاندی کا تھا وہ جہیز میں ملا تھا اور قدِ آدم آئینہ بھی جہیز میں ملا تھا۔ رہی سیر و تفریح کی بات تو وہ دارالاسلام سے باہر نکلتی تھیں اور جنگل میں عصر کے بعد اس وقت پہنچتی تھیں جب ان کے شوہر کے سوا کوئی آدم زاد نہ ہوتا کوئی تھا کیا یہ کوئی قابلِ نکیر بات ہے؟

(۸) آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ مجھے مودودی صاحب کی کس کتاب نے متاثر کیا۔ جواب یہ ہے کہ مجھے ان کی ہر تحریر نے متاثر کیا اگر ان کی تحریروں نے متاثر نہ کیا ہوتا تو اپنے جیسے بھولے شیوخ کے سیاسی فکر و عمل سے منحرف ہو کر کیوں ایک ایسے آدمی کی دعوت قبول کرتا اور کیوں اس کی جماعت میں شمولیت اختیار کرتا جس کو اس وقت تک دیکھا نہ تھا۔ ذہنی اور نوعیت کی شناسائی تھی، لیکن مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا "چار بنیادی اصطلاحیں" نے۔ اس کا دلچسپ قصہ ہے۔ ہم لوگ طالب علمی کے زمانے میں ترجمان آتا تھا۔ ہم میں اس کتاب کی قسطیں آنا شروع ہوئیں تو اس کا مقدمہ پڑھنے کے بعد مجھ پر یہ تاثر پڑا کہ مولانا مودودی صاحب ہماری موجودہ صورتِ حال کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ ہم فارغِ تحصیل ہونے کے بعد جلالین اور بیضاوی تفسیر نصاب پڑھ چکنے کے بعد ادب و انشاء کی مشق کر رہے تھے اور میں کند ذہن بھی نہ تھا۔ اس وقت تک اِلٰہ کے معنی معبود، اور معبود کے معنی جس کی عبادت کی جائے، اور عبادت کے معنی نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج۔ بس یہی کچھ سمجھتے رہے اس لفظ کی لغوی تحقیق، اس کے قرآنی استعمالات اور اس کے وسیع تصورات کی خبر نہ تھی۔ رب کے معنی پروردگار، دین کو دھرم اور مذہب (RELIGION) ہی جانتے تھے۔ غرض ہم نے مقدمہ پڑھ کر

بھی خیال کیا کہ صاحب کتاب ہمارے اپنے دور کی تصویر کشی کر رہے ہیں اور مسئلہ کو شاید بنا کر عرض کرتا ہوں کہ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال نہیں ابھرا کہ مولانا مودودی علمائے امت، مفسرین و محدثین اور فقہائے قرآن کی تجہیل کر رہے ہیں۔ یہی خیال مولانا سید سلیمان ندوی کی درج ذیل عبارت پڑھ کر پیدا ہوا، خیال تک نہ گزرا کہ سید صاحب علمائے متقدمین کی تجہیل فرما رہے ہیں۔ انھوں نے فرمایا:

"یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے، مگر حقیقت ہے کہ اسلامی دعوت کی وسعت جو انسانی زندگی کے ہر گوشہ تک وسیع تھی، گھٹتے گھٹتے صرف چند عقائد و عبادات تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔"

ملاحظہ فرمائیے، اگر کوئی اس عبارت کو بھی اچھالا کر "تنقیدی دیانت" بیچنے اور لکھنے پر تل جائے تو اس کے قلم کو کون روک سکتا ہے۔

(۵) مجھے جب یہ اطلاع ملی کہ حضرت مولانا علی میاں مدظلہ جماعتی فکر پر کوئی تنقیدی کتاب لکھ رہے ہیں تو ارادہ کیا کہ انہیں ایسا کرنے سے رک جانے کی گزارش کروں لیکن پھر خیال ہوا کہ وہ حقیقت پسند آدمی ہیں، کیا حرج ہے کتاب آ جانے دو، ممکن ہے جماعتی فکر پر کوئی قابل اصلاح چیز سامنے آئے تو جماعتی ذمہ دار حضرات اصلاح کر لیں۔ کتاب "عصر حاضر میں دین کی تفہیم و تشریح" شائع ہوئی، بڑے پیمانے پر مبلغین نے اسے اکرام مسلم کے اولین تقاضے کے طور پر چھپوانا شروع کیا اور ہمارے علم کے مطابق اب تک ان کا یہ نیک عمل جاری ہے۔ پھر مولانا سید احمد عروج قادری نے اس پر تبصرہ کیا، وہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس مرحلہ پر مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ انھوں نے "فتنہ" کی حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے ایک "اندیشہ" کا اظہار کیا ہے اور وہ اندیشہ یہ ہے کہ جماعت سے وابستہ لوگ کتاب و سنت، سیرت و اسوۂ رسول، فکر آخرت اور ایمان و احتساب کی شاہراہ سے ہٹ کر محض جماعتی تنظیم اور مسلمانوں کے لئے حکومت و اقتدار کے راستہ پر پڑ جائیں اور پھر ان کی واپسی مشکل ہو جائے

جماعت اسلامی کے وابستگان سے درخواست ہے کہ مولانا کے اس "اندیشہ" کو "فتویٰ" نہ بننے دیں گے۔ البتہ یہ بات کہ جماعت کے افراد کتاب و سنت، سیرت اور اسوۂ رسول سے ہٹ رہے ہیں، فکر آخرت اور ایمان و احتساب کی شاہراہ سے منحرف ہو رہے ہیں، محض جماعتی تنظیم اور مسلمانوں کے لئے حکومت و اقتدار کے راستہ پر چل نے جا رہے ہیں۔ یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ کئی دفعہ پوچھنا چاہا لیکن ہمت نہ پڑی۔ دو وجوہات، ایک یہ کہ اب پوچھنے کا کیا فائدہ جب دونوں طرف سے کتاب اور جواب الکتاب شائع ہو گئیں۔ دوسری یہ کہ وہ میرے محسنین میں سے ہیں، ان سے کیا بحث کروں۔ البتہ ان کی خدمت میں اس وقت اس مضمون کا یہ شکایت پیش

کرنی ہے کہ جب وہ دفعہ سے قریبی زمانہ میں مولانا مودودی سے ملے تھے تو خود زیر بحث والی عبارت کو پیش کیوں نہ کیا؟ اگر پیش کیا تھا تو انھوں نے کیا جواب دیا؟ اس کا ذکر "عصر حاضر" میں کرنا تھا، اس سے سب جان لیتے کہ مودودی صاحب تمام علمائے امت، محدثین، فقہاء اور مفسرین کی تجہیل کر رہے ہیں۔ سید صاحب تو خود بالا عبارات کے ڈھنگ میں "غیر شعوری محدودیت مفاہیم" کی تصویر کشی کر رہے ہیں۔ گفتگو کے دوران اگر وہ یہ محسوس کرتے کہ الفاظ مبہم رہ گئے ہیں تو یقیناً وہ عبارت میں ترمیم کا آپ سے وعدہ کر لیتے۔ اگر یہ سب ہو جاتا اور اس کا ذکر کتاب میں آ جاتا تو کتاب نہایت مؤثر ہوتی اور یہی بات تشفی بخش ہوتی کہ یہ کتاب مولانا علی میاں نے لکھی نہیں ہے لکھوائی گئی ہے اور کتاب ان کے مزاج سے میل نہیں کھاتی۔ اس سے پہلے جو بعض کتابیں لکھی گئی ہیں یہ کتاب انہی کی ایک دوسرے رنگ میں تشریح ثانیہ ہے۔ علاوہ بریں جبر کر کے آخری بات لکھ دوں۔ واقعہ یہ ہے کہ مجھے افسوس ہی افسوس ہے مولانا علی میاں نے مقدمہ کی جس عبارت کو پوری امت پر پھیلایا ہے اس سے مجھے کسی طرح کی حیرانی ہوئی جیسی حیرانی دستور کی دفعہ پر مولانا مدنی کے اعتراض پر ہوئی تھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس عبارت کا ڈانڈا صحابہ کرام سے بھی ملایا جا سکتا تھا۔ دفعہ ۶ کی عبارت مرتب کرتے وقت مرتب کے حاشیہ خیال میں بھی صحابہ نہ تھے۔ میں تصور تک نہیں کر سکتا تھا کہ مولانا علی میاں مدظلہ کوئی تنقیدی کتاب جماعت پر شائع کریں گے اور دوسرے جواب الکتاب شائع ہو گا!! اس موقع پر ایک بات عرض کرتا ہوں کہ جب عصر حاضر شائع ہوئی اور ایک نسخہ مصنف نے ہدیۃً بھیجا تو میں نے مولانا مودودی کے سامنے ان کی عبارت رکھی اور وہ تمام تاثرات و خدشات پیش کئے اور خاص طور پر یہ پوچھا کہ کیا متکلم علمائے سلف کی تجہیل مقصود ہے؟ میرا خیال تھا انھوں نے جو چند سطری کارڈ جواب میں لکھا وہ تو ایک طالب علم کی غفلت سے ضائع ہو گیا۔ البتہ اس کا مفہوم اپنے الفاظ میں بغیر تحریف پیش خدمت ہے:

"مولانا علی میاں کی کتاب اور ان کا مکتوب دونوں اس سے پہلے میرے پاس پہنچ چکے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے، کیا میں نے صرف یہی ایک کتاب لکھی ہے؟ میں ان کے خلاف کچھ نہ لکھوں گا۔

اور دوسری بھی جو کچھ شائع ہوا ہے وہ میری اجازت کے بغیر میری مرضی کے خلاف شائع ہوا ہے۔"

"میں ان کے خلاف کچھ نہ لکھوں گا" پس منظر یہ ہے کہ مرحوم سے استدعا کی تھی کہ ایک مختصر توضیحی نوٹ کتاب کا جواب شائع کر دیں تو اچھا ہے، دیکھئے کیا مناسب سمجھیں۔

(۱) تفہیم القرآن کے سوال کا جواب یہ ہے کہ وہ دورِ حاضر کی ایک عظیم تفسیر ہے۔ یہ ایک دعوتی، ورحرکی کتاب ہے۔ یہ ایک رہنما تفسیر ہے جو بتاتی ہے کہ دورِ حاضر میں دعوت الی اللہ کا کام کس طرح کیا جائے۔ مغربی اور مشرقی مستشرقین اور مستغربین کے پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات کے کانٹے چن چن کر نکالتی ہے۔ یہ تفسیر جدید تعلیم یافتہ حضرات بالخصوص نوجوان تعلیم یافتہ پر ایک عظیم احسان ہے جس کی قدر و قیمت وہی جان سکتے ہیں۔ یہ کتاب متقدمین علماء تفسیر کی آراء و اقوال میں کسی ایک قول کو اختیار کرتی ہے۔ آراء سلف سے شاذ و نادر ہی ہٹتی ہے اور جب ہٹتی ہے تو ہٹنے کے دلائل بھی سامنے رکھ دیتی ہے۔ لیکن صاحب تفسیر انسان ہیں، آپ ان سے ہٹ کر کوئی رائے اختیار کر سکتے ہیں، انسان سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں، جس طرح دوسرے تمام انسانی قدردان کتاب سے ہوتی ہیں جن کی تحریریں ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوتی ہوں ان سے غلطیوں کا صدور ناممکن نہیں ہے خواہ وہ قدیم ہوں خواہ دینی ہوں یا جدید۔ قرآن کے طالب کو اس سے اور سب تفسیروں سے استفادہ کرنا چاہئے۔ وہ تنگ نظروں کی طرح استفادہ کرنا چاہئے، رکھی یا ہیئتی آنکھوں سے نہیں۔ ہر تفسیر کا اپنا رنگ ہے۔ ہر پھول کی خوشبو جدا ہے۔ مطالعہ قرآن میں طالبان قرآن کو شہد کی مکھی کی طرح ہونا چاہئے جو ہر پھول سے رس چوستی ہے، اور مکھی کی طرح نہ ہونا چاہئے جو صرف گندگی سے دلچسپی رکھتی ہے اور خیر۔ اگر سلف کی کوئی رائے کمزور معلوم ہو تو ان کی تحقیر ہرگز نہ کیجئے، آپ کے سامنے ان کے حوالے سے صرف ان کی رائے آتی ہے، کن وجوہ سے انہوں نے یہ رائے اختیار کی ان کے دلائل آپ کے سامنے نہیں آئے، یہی آپ خواہ وہ رائے نہ لیں لیکن تحقیر و تخفیف صاحب تفسیر کی ہرگز نہ کیجئے۔ اور یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ زمانہ حال کی کتاب پر وابستہ تحریف اور دجل و تلبیس اور بدنیتی کا الزام تھوپنا اپنی ہی محرومی کا اعلان کرنا ہے۔ تفہیم القرآن کے ساتھ اس کے معاصر علماء کے ایک طبقے نے جو سلوک روا رکھا ہے اس کی تفصیل کی اس مضمون میں کہاں گنجائش ہے!!

(۲) مولانا نے بریلی سے مجھے خط لکھ کر ایک تبرئی انجینئر جو جماعت کے ہمدرد ہیں عربی زبان پڑھنا چاہتے ہیں، تم رکھ سکتے ہو؟ میں نے ہامی بھرلی اور دار السلام پہنچ گیا۔ میری پہلی ملاقات مولانا سے اس وقت ہوئی جب دانی باں کا پانی لگانے کھڑے تھے اور وہاں کے رفقاء کھیل رہے تھے۔ سلام اور مصافحہ کے بعد فرمایا: "میں اسے کھینچنے والوں کی قیادت کر رہا ہوں" اور سب مسکرا دیے۔ اس سے میں نے یہ تاثر لیا کہ مولانا خوش طبع آدمی ہیں۔ بعد کی ایک ملاقات اس دن ہوئی جس دن مولانا امین احسن اصلاحی صاحب مدرسۃ الاصلاح سے مستقلاً ہجرت

کر کے دار الاسلام پہنچنے والے تھے۔ کچھ لوگ انہیں سرنا اسٹیشن پہنچے گئے ہوئے تھے۔ مولانا مسجد کے شمالی جانب کھڑے منتظر کر رہے تھے، میں بھی وہیں جا کر کھڑا ہو گیا۔ مولانا اصلاحی صاحب تشریف لائے، سلام و مصافحہ ہوا، مولانا نے ان کے سامان رکھوانے اور غسل کا انتظام کرنے کے لیے حکم دیا۔ مولانا اصلاحی کے جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ مولانا کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں خوشی کے آنسو۔ اور فرمایا اب تک میں اکیلا تھا، اکیلا سب کام کرتا تھا، خدا کا شکر ہے اس نے مجھے ایک طاقتور بازو عطا فرما دیا۔ اس مختصر مدت حاضری میں مجھے اندازہ ہو گیا وہ سب خوبیاں جھلکیں جو ایک اجتماعی نظام کو چلانے کے لیے ضروری ہیں۔ دار الاسلام کے تعلیم متعلم نے بتایا کہ نہایت حلیم تھے، کسی کی اصلاح سے جلد باز نہ ہونے والے تھے، اپنے رفقاء کی غلطیاں مسلسل دیکھتے اور نرمی سے سمجھا دیتے۔ ان کی خوبیاں کہاں تک گنائیے۔ یہ تو مجھے نہیں کہنا چاہیے کہ ان کی وفات پر مجھے سب سے زیادہ غم ہوا لیکن تین دن تک دل تھوڑے تھوڑے وقفے سے اچھلتا رہا اور بہ دو زبان بہت ٹیک کا آنسو دیتا، اسی طرح کی کیفیت چار پانچ دن اس وقت بھی رہی جب مولانا اختر احسن صاحب اصلاحی کی خبر وفات دیر سے پہنچی تھی۔ ان دونوں حادثوں کی خبر سن کر آنسو غائب ہو گئے تھے۔

(۳) مودودی صاحب کے دو کارنامے عظیم تر ہیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے دعوت الی اللہ کا راستہ دکھایا جبکہ ہندوستان بھر کے علماء، محدثین اور فقہاء نہیں جانتے تھے، ہاں نہیں جانتے تھے کہ اس ملک میں اس وقت کے ظروف و حالات میں اسلامی دعوت کا کیسے اٹھا جائے اور اگر کچھ جانتے بھی رہے ہوں گے تو وہ اٹھنے کی ہمت کھو چکے تھے۔ یہ میرے نزدیک ان کا عظیم تر کارنامہ ہے اور دوسرا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی کو سو برس تک اپنے سے چمٹائے رہے۔

آخر میں وابستگان دعوت و جماعت سے دوبارہ عرض کرتا ہوں کہ "علم حاضر" میں حضرت مولانا علی میاں ندوی نے جس خوشی کا اظہار کیا ہے "دائمہ" نہ بننے دیجئے، پوری خیر خواہی سے اپنا احتساب کرتے رہیے۔ اگر کوئی آپ کو کہتا ہے کہ تم متقی نہیں ہو تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ نہیں جناب میں تقویٰ کے بلند ترین مقام پر فائز ہوں؟ نہیں، بلکہ آپ صبر کریں گے، سا تعلق اختیار کریں گے اور خدا کی طرف متوجہ ہوں گے۔ آپ کا معاملہ آپ کے اپنے رب سے ہے۔ اگر شاہراہ حق سے ہٹے ہوئے ہیں تو خدا کی پکڑ سے آپ کو کوئی بچا نہیں سکتا اور اگر قلب سلیم اور اتباع حق صراطِ مستقیم کی پونجی لئے ہوئے اپنے رب کے حضور حاضر ہوئے تو کون آپ کو اس کے عدل سے محروم کر سکتا ہے۔ آپ یقیناً خدا کے محبوب ہوں گے چاہے دنیا بھر کے دانشور آپ کی گمراہی کے فتوے جاری کیے ہوں۔ کوشش کیجئے کہ آخرت میں اللہ کی شفقتوں اور رحمتوں سے محروم نہ رہیں اگرچہ دنیا میں علماء کی شفقتوں اور دعاؤں سے محروم رہنا پڑا۔

(بشکریہ "ذکریٰ" احیاء اسلام نمبر ۲)

محمد حمید پانڈے

N.C.E.R.T کی کتابوں پر ایک تبصرہ

محمد حمید نوشک ۱۰۰۰ میں "اسلامی مدارس کے لئے جدید نصاب تعلیم کا ایک جائزہ" کے عنوان سے ایک جدید نصاب کا جو لے خاکہ شائع کیا گیا تھا جس میں N.C.E.R.T کی کتابیں شامل تھیں۔ اس نصاب پر اہل علم اور اصحاب فکر سے اپنی رائے دینے کی درخواست کی گئی تھی۔ محمد حمید پانڈے کا تبصرہ قارئین کے لئے حاضر ہے۔ (ادارہ)

ممالک اور ان کے باشندے حصہ اول تا سوم نصابی کتب برائے درجات ششم تا ہشتم، شائع کردہ نیشنل کاؤنسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ۔ مترجم سومیتا سنہا وغیرہ۔

ان کتابوں پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے پر جو تاثر میرے ذہن پر مرتسم ہوا درج ذیل ہے۔

کتابیں عمدہ کاغذ اور آفسیٹ پر چھاپی گئی ہیں۔ صرف چند ہی مقامات پر عبارات اور نقشہ جات کا عکس دھندلا یا کم واضح ہے لیکن پروف ریڈنگ احسن طریقے سے نہیں کی گئی ہے۔ بہت سی جگہوں پر کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ حصہ سوم میں صفحہ ۹۷ اور ۱۳۵ پر ہندوستان کی آبادی ۶ کروڑ ۸۳ لاکھ درج ہے جبکہ تینوں کتابوں کی کتابت کی چند غلطیاں ایسی بھی ہیں جن سے مطلب خبط ہو جاتا ہے۔

سرسری مطالعے سے بھی اندازہ ہوا کہ یہ کتابیں انگریزی میں تحریر شدہ کتابوں کے تراجم ہیں۔ گو کہ مؤلفین اور مترجمین بھی اپنے اپنے فن کے ماہر ترین فرد ہیں، تاہم مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سبھی کتابیں کسی ایک شخص کی ترجمہ کی ہوئی نہیں ہیں کیونکہ ایک ہی کتاب میں ایک سے زائد طرز تحریر محسوس ہوتا ہے۔

میری دانست میں زبان و بیان کا معیار بھی ہماری درسگاہوں کے طالب علموں کے معیار سے بلند ہے۔

کہیں کہیں اصطلاحات کے ترجمے بھی غیر مانوس ہیں مثلاً DENSITY OF POPULATION

کے لئے آبادی کا گنجان ہونا یا گھنا پن نہ استعمال کر کے کثافت استعمال کیا گیا ہے یا PHYSICAL کے لئے قدرتی بناوٹ، جسمی ساخت یا طبعی بناوٹ کے الفاظ کے بجائے کتاب کے حصہ سوم میں کہیں خط و خال کہیں خد و خال کثرت سے استعمال ہوا ہے جو میری دانست میں درست نہیں ہے۔

کچھ انگریزی الفاظ کو بلا وجہ موثر کیا گیا ہے جس کی واضح مثال ٹراپیکوں، ٹراپیکی اور نیم ٹراپیکی ہیں۔ (حصہ سوم صفحہ ۱۱)

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حصہ سوم کا ترجمہ کسی ایسے شخص نے کیا ہے جس کی علم جغرافیہ کی واقفیت واجبی ہی ہے۔

جہاں تک میرے علم و فہم کی رسائی ہے WITHIN THE TROPICS کا مطلب مابین خطوط سرطان و جدی ہوتا ہے لیکن حصہ سوم کے صفحہ ۱۱ پر تحریر ہے کہ "ہمارے ملکوں کا جنوبی حصہ دونوں ٹراپیکوں کے مابین ہے۔" یہ بات یکسر غلط ہے کیونکہ ہمارے ملک کا جنوبی حصہ خط استوا اور خط سرطان کے مابین واقع ہے۔ جزائر نکوبار کا جنوبی حصہ بھی ۶ درجہ شمالی عرض البلد ہی تک واقع ہے۔ لفظ "ٹراپیکی" بھی ہمارے طالب علموں کے لئے نہ صرف غیر مانوس بلکہ ناقابل فہم ہے۔ لفظ TROPICAL کا ترجمہ ٹراپیکی نہیں بلکہ گرم و مرطوب ہے اور یہی لفظ اب تک استعمال بھی ہوتا رہا ہے۔

کتاب میں اسی جگہ یہ بھی تحریر ہے کہ ہندوستان کا شمالی حصہ نیم ٹراپیکی خطہ میں پڑتا ہے۔ یہ فقرہ کم از کم میرے لئے ناقابل فہم ہے۔ غالباً مترجم کا مطلب یہ ہے کہ یہ خطہ کم گرم اور کم مرطوب ہے، یا منطقہ معتدلہ کے شمالی حصہ میں پڑتا ہے۔

نقشے اور اشکال کسی بھی کتاب کا بنیادی حصہ ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کتابوں کے ہر حصہ میں جو اشکال اور نقشہ جات بیان کی وضاحت اور تفہیم کے لئے استعمال ہوئے ہیں بہت موزوں و مناسب ہیں لیکن یہ بھی ہمارے طالب علموں کے لئے قطعی ناقابل فہم صرف اس لئے ہیں کہ باستثناء حصہ اول کی چند شکلوں کے سبھی کتابوں کے سبھی اشکال و نقشہ جات انگریزی میں ہیں۔ حتیٰ کہ وہ اشارات بھی جو ان نقشوں کی وضاحت کے لئے دیئے گئے ہیں۔

ان درجات کے ہمارے طالب علموں کا انگریزی کا علم بہت محدود ہے۔ اس لئے وہ ان سے قطعی استفادہ نہیں کر سکتے اور یہی نقشہ جات جو ان کتابوں کی قدر و قیمت میں اضافہ کا باعث ہو سکتے ہیں

ہمارے مذہب و علوم سے قطعی ناواقف ہیں۔

کتابوں کا عنوان "ممالک اور ان کے باشندے" ہے لیکن ان کتابوں میں ممالک کا ذکر تو بہت زیادہ ہے مگر باشندوں کا ذکر برائے نام ہے۔ میرے خیال میں باشندوں کے بیانات میں تو وہ خصوصیات ہی کے ساتھ کیوں نہ ہو ان کے رنگ نسل، مذہب، ثقافت، معاشرت اور رسم و رواج کا بیان ازبس ضروری ہے کیونکہ دسویں جماعت تک جغرافیہ ایک الگ علم کی حیثیت سے نہیں بلکہ علوم عمرانی کے ایک جز کی حیثیت سے داخل نصاب ہے جس کے دیگر دو اجزاء علم تمدن اور علم تاریخ ہیں۔ مگر ان کتابوں کے مطالعے سے ہرگز یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ عمرانی علوم کے ایک جز کی حیثیت رکھتی ہیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علیحدہ علم جغرافیہ کی ابتدائی کتابیں ہیں۔

ہم جس مقصد سے جغرافیہ اپنی درس گاہوں کے وسطانی مرحلہ میں پڑھانا چاہتے ہیں اس کی مطلب براری ان کتابوں سے ہو سکے گی، اس میں مجھے شبہ ہے۔ ہم ابتداء ہی سے اپنے بچوں کو یہ ذہن نشین کرا دینا چاہتے ہیں کہ ہم اپنے اس دور زوال میں بھی ایک عالمگیر مذہب، ثقافت و تمدن کے حامل ہیں۔ ہم تو عام طور پھیلے ہوئے ہیں اور جہاں کہیں بھی ہیں نسلی، قومی، لسانی اختلاف کے باوجود ایک ہمہ گیر مسلم ثقافت اور انداز فکر کے حامل ہیں اور موجودہ عالمی یوروپی تہذیب سے الگ ایک اپنا نقطہ نظر اور اپنی ایک الگ تہذیب رکھتے ہیں۔ جغرافیہ کی بھی کوئی ہماری کتاب اسلام اور مسلمانوں کے ذکر سے اس طرح خالی نہیں ہو سکتی جیسا کہ یہ کتابیں ہیں۔

اس سلسلہ کی پہلی کتاب جو براعظم ایشیا اور افریقہ کے بارے میں ہے، اسلام اور مسلمانوں کے ذکر سے یکسر خالی ہے۔ صرف ایک مقام صفحہ ۲۹ پر پہلی اور آخری بار لفظ مسلمان آیا ہے "مصر کے زیادہ باشندے عرب ہیں، مسلمان ہیں۔" چلئے مصر کے باشندوں کا یہ بیان کتاب کے مولف کے نزدیک بالکل کافی ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مصر کیا افریقہ کے بیشتر ممالک میں نہ صرف ہماری اکثریت بلکہ غیر معمولی اکثریت ہے۔ اور کہیں بھی ہم اتنی خاطر خواہ اقلیت میں نہیں ہیں۔

ان کتابوں کا آخری حصہ ایشیا باستثناء روس کے بارے میں ہے۔ یہاں پورے براعظم کے بیان میں ہمارے مذہب و ثقافت کے ذکر کو نظر انداز کرنا میرے خیال میں صحیح نہیں ہے۔

یہ کتابیں چونکہ ایک سرکاری ادارہ کی جانب سے مرتب کی گئی ہیں اس لئے ان کو سرکاری نقطہ نظر اور انداز فکر کا حامل ہونا ہی چاہئے لیکن مرتبین عالمی کوششی انداز فکر اور یوروپی تہذیب کے دلدادہ بھی

معلوم ہوتے ہیں اس لئے ان کا نقطہ نظر ہندوستانی ہونے کے بجائے یوروپی ہو گیا ہے اور یوروپی نقطہ نظر اور انداز فکر ہمارے نقطہ نظر اور انداز فکر سے قطعی متضاد ہے۔ اس سلسلہ کی تیسری کتاب کے آخری باب کے عنوانات "ہماری آبادی، ہمارے لئے اس کا کیا مطلب ہے، اور ہماری آبادی کتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے" کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ مرتبین ہر مسئلہ کو یوروپی نظر سے دیکھتے ہیں۔ خود مرتبین کے مطابق دنیا کے گنجان ترین آباد ممالک کی آبادی کا اوسط حسب ذیل ہے:

چین کے زرخیز علاقوں میں ۲۰۰ سے ۸۰۰ افراد فی مربع کیلومیٹر، صفحہ ۱۳۲ حصہ اول۔

جاپان میں ۲۱۲ افراد فی مربع کیلومیٹر صفحہ ۱۳۱ حصہ اول۔

نیدرلینڈ جمہوریہ جرمنی میں ۲۴۸ افراد فی مربع کیلومیٹر صفحہ ۱۱۲ حصہ سوم۔

سلطنت متحدہ میں ۲۲۹ " " " " " " " " " "

ہندوستان میں ۲۲۱ " " " " " صفحہ ۱۸۸ " " "

ان پانچوں ممالک کے مقابلہ میں ہندوستان ہی میں آبادی کا تناسب سب سے کم ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی واضح ہے کہ ان میں ہندوستان ہی سب سے غریب ملک بھی ہے۔ اب کیا کسی محقق کے سوا کسی اور کو یہ بتانے کی حاجت رہ جاتی ہے کہ آبادی کی کثرت ہی کسی ملک کی مفلوک الحالی کی واحد وجہ نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود کتاب کے حصہ سوم کے مرتب نے اپنی کتاب کے آخری باب کے ذریعہ ہمارے بچوں کے ذہن میں یہ بٹھانے کی سعی کی ہے کہ ہمارے ملک کی بڑھتی آبادی ہمارے لئے ایک عظیم خطرہ ہے۔

کسی ملک کے شہری ہی اس کا سب سے قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں اور وہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ جاپان دنیا کا ایک خوشحال ترین ملک ہے اور ہندوستان ایک مفلوک الحال۔ لیکن کیا جاپان کی خوشحالی اور ہندوستان کی مفلوک الحالی کا راز ایک کے شہریوں کی فرض شناسی، ایمانداری، محنت اور کام کرنے کی لگن اور دوسرے کے شہریوں کی نافرض شناسی، کام چوری، بے ایمانی اور کام چوری کے علاوہ کچھ اور ہے؟ اگر اصل راز یہی ہے تو ہندوستان کے اضافہ آبادی کے لئے یہ واویلا اور سینہ کوبی کیوں ہے؟

اس لئے میری حقیر رائے میں یہ کتابیں ہمارے نصاب درسی کی کتب کی حیثیت سے داخل کئے جانے کے لئے موزوں نہیں ہیں۔ •••

غزلیں

تابش مہدی

مہ رُخوں کی طرح، گل رُخوں کی طرح
ہم جہاں بھی رہے جگنوؤں کی طرح

شہر و قریہ کی تخصیص اچھی نہیں
ہر طرف پھیلیے خوشبوؤں کی طرح

سنگ ریزہ سمجھ کر نہ ٹھکرائیے
ہم کو رکھیے سمیٹے موتیوں کی طرح

شہر کا شہر جس کی پناہوں میں تھا
پھر رہا ہے وہی بے گھروں کی طرح

بزدلوں کی طرح زندگی موت ہے
زندگی چاہیے باغیوں کی طرح

اب مداوائے ظلم و ستم کیجیے
حال مت پوچھیے محسنوں کی طرح

غم زدوں کی طرح ہنس کے مت دیکھیے
چوٹ لگ جائے گی پتھروں کی طرح

آپ کیوں اپنے تابش سے ہیں بدگماں
اس کا دل صاف ہے آئینوں کی طرح

عزیز الدین عزیز —— بلگام (کرناٹک)

خوش ہو رہے ہیں تیری دو نیاں دیکھ کر
روئیں دوست تری پستیاں دیکھ کر

لوگ غم کو مرے بھول کر رہ گئے
میرے چہرے کی شادابیاں دیکھ کر

باز ظالم کو آنا پڑا ظلم سے
میری بے لوث قربانیاں دیکھ کر

کوئی شاید تھا پردیس کا بادشاہ
رو رہا تھا مری بستیاں دیکھ کر

ترک رہبر کو کرنی پڑی رہبری
رہنماؤں کی کوتاہیاں دیکھ کر

بدگمانی زمانے کو ہونے لگی
ہم کو مصروف سرگوشیاں دیکھ کر

راستے بانٹ لینے لگے راہبر
قوم کی مختلف ٹکڑیاں دیکھ کر

فیصلہ ہے کس طرح کام لوں میں عزیز
اپنی نسلوں کی پامالیاں دیکھ کر

غزل

محمد قمر الدین قمر رام نگری

خدا کو بھول کے بندہ جو خود سری کا رہا
خیال کب اسے کچھ نیکی و بدی کا رہا

عمل تھے ایسے کہ شیطان بھی جن سے شرمائے
نظر کے سامنے چہرہ تو آدمی کا رہا

وہ جب ملے تو اچانک نکل پڑے آنسو
میں سوچتا ہوں کہ موقع تو یہ خوشی کا رہا

یہ ایک شمع مسرت کہ گزرتی لگتی ہے
بھروسہ کچھ بھی نہ انساں کی زندگی کا رہا

خدا کی ذات کا انکار بھی کریں گے لوگ
یہی زوال تو بندوں کی بندگی کا رہا

کسی کو شکوہ نہ ملا جیسے تو وہ بھی ہے
سدا سے حال یہی شہر زرگری کا رہا

بچا کے ایمان سلامت گیا جو دنیا سے
سنا ہے آدمی وہ ساتویں صدی کا رہا

جسے بھی جان و دل بھاتا ہے وفا نکلا
یہ تجربہ بھی عجب اپنی زندگی کا رہا

یہ اور بات ہے کہ اس نے دشمنی رکھی
ہمارا رشتہ تو یوں اس سے دوستی کا رہا

نظر آئے جو دن وعدوں کے شب پرستوں کو
تصور ایسے کبھوں میں روشنی کا رہا

ہمارا بھی ہے ہر اک سمت بندگی کا تھا کی
زبان اردو نہ عربی نہ فارسی کا رہا

قدم قدم پہ گرے گر کے پھر اٹھے تھے
نحیف حال قمر ابھی بےخودی کا رہا

اقبال کا اہم ترین منصوبہ

مظفر حسین

مسلم ورلڈ بک ریویو لندن کے تازہ ترین شمارہ (جلد ۵، شمارہ ۱، خزاں ۱۹۸۴ء) میں ضیاء الدین سردار کا ایک فکر انگیز مضمون شائع ہوا ہے جس میں امتِ مسلمہ کی حیاتِ مستقبل کے بارے میں عصرِ حاضر کے اسلامی لٹریچر کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے اور آخر میں یہ لکھا ہے کہ پوری اسلامی دنیا میں صرف دو تحریریں ایسی ملتی ہیں جو اس نقطۂ نظر سے مفید قرار دی جا سکتی ہیں اور جن سے امت کے مستقبل کے بارے میں رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے یا جو بنیادی آئندہ فکری منصوبہ بندی میں بنیاد کا کام دے سکتی ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب علامہ اقبالؒ کے شہرہ آفاق خطبات اور دوسری کتاب ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی "آئیڈیالوجی آف دی فیوچر" ہے۔ ان کے علاوہ جو بھی کتابیں ملتی ہیں وہ یا تو مغربی غیر مسلم مستشرقین کی لکھی ہوئی ہیں، اور جن کی ساری کوشش یہ ہوتی ہے کہ اسلام کو مغرب کے استعماری مفادات کے تابع رکھا جائے یا ایسے مسلمان مصنفین کی تصنیف کردہ ہیں جو مغرب سے بُری طرح مرعوب ہونے کی وجہ سے اسلام کے بارے میں معذرت خواہانہ نقطۂ نظر اپنانے پر مجبور ہیں۔

ضیاء الدین سردار کا یہ تجزیہ ہمارے سامنے ایک افسوسناک صورتِ حال پیش کرتا ہے۔ مسلمان اقوام کے موجودہ مصائب و آلام کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ دورِ حاضر کے مسائل سے کماحقہٗ آگاہ نہیں جو انہیں درپیش ہیں اور نہ وہ ان مسائل کے بارے میں ضروری تجسس و تحقیق کی اہمیت اور ضرورت محسوس کرتے ہیں جبکہ علامہ اقبالؒ آج سے نصف صدی پیشتر ان آنے والے خطرات کا گہرا شعور رکھتے تھے اور ملتِ اسلامیہ کو ان خطرات کا احساس دلانے کی کوشش کرتے رہے۔ چنانچہ ۲۲ مارچ ۱۹۳۲ء کے روزنامہ "انقلاب" میں آپ کا ایک بیان شائع ہوا جس کے مندرجہ ذیل الفاظ خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں:

"ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو دورِ حاضر میں پیش آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کی قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ محسوس کر سکے۔"

علامہ اقبالؒ بحرِ عصرِ حاضر کے ان فکری طوفانوں کے بارے میں فکر مند رہے جن کی تند و تیز موجوں پر آج بھی ملتِ اسلامیہ کا سفینہ غلطاں و پیچاں ہے۔ وہ تغیراتِ زمانہ کا شعور و ادراک اور ان کی روشنی میں اسلام کی ازسرِنو تعبیر کی ضرورت کا گہرا احساس رکھتے تھے۔ وہ اسلام کی فکری وسعتوں کے رمز شناس تھے اور اس بات پر پختہ یقین رکھتے تھے کہ اسلام اپنے ابدی اصولوں پر قائم رہتے ہوئے انقلابِ زمانہ کو اپنی وسعتِ دامن میں سمیٹ لینے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔ اسلام کے بارے میں ان کے اس حرکی نظریہ کو سمجھنے کے لئے ان کا یہ شعر ہی کافی ہے۔

ظاہرِ او انقلابے ہر دمے   باطنِ او از تغیر بے غمے

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اس بات کے راوی ہیں کہ آپ نے ایک بار ڈاکٹر تاثیر سے فرمایا تھا:

ISLAM IS AN ASPIRATION ; NOT AN ACHIEVEMENT

ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو دورِ حاضر میں پیش آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کی قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ محسوس کر سکے۔

یہ جملہ درحقیقت مندرجہ بالا شعر ہی کی وضاحت کرتا ہے اور ASPIRATION اور ACHIEVEMENT کے الفاظ کے پیچھے جو معنی علامہ اقبالؒ کے پیشِ نظر ہیں وہ اس شعر سے جھلکتے ہیں کہ اسلام کی جدید ترین علمی تعریف ASPIRATION اور ACHIEVEMENT کے الفاظ کو علمی اصطلاحوں کا درجہ عطا کرتے ہیں۔ ایک دوسرے موقع پر آپ نے یہی حقائق سمجھانے کے لئے ایک نہایت ہی عام فہم مثال کا سہارا لیا۔ پاکستان کے ایک پرانے اور نامور صحافی احمد بشیر صاحب اس واقعے کے راوی ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے ایک گفتگو کے دوران اسلام کے لئے موٹر کار کی مثال دی اور فرمایا کہ موٹر کار کی شکل و صورت اگرچہ شروع میں کچھ اور تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی ساخت میں تبدیلیاں رونما ہوتی چلی گئیں۔ اب اس کی ظاہری ہیئت کچھ سے

کچھ اور ہو گئی ہے۔ بہرحال یہ موثر کام اب بھی موثر کار ہی ہے کیونکہ اس کا بنیادی مقصد اور افادیت وہی ہے جو روزِ اول تھی۔

اسلام کا یہ حرکی تصور اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ تاریخ ہر دور کے ساتھ ساتھ انسانی معاملات میں جو جدید مسائل رونما ہوتے ہیں ان کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کے لئے مسلسل تحقیق کی جائے۔ چنانچہ علامہ اقبالؒ نے اپنے آخری زمانہ میں اسلامی اصولوں کی روشنی میں جدید عصری مسائل پر تحقیقات کی غرض سے ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کی کوشش کی جس کا نقشہ ایک مدت سے ان کے ذہن میں تھا۔ مولانا غلام محمد مرحوم جو حضرت علامہؒ

مدت دراز سے ان کے ذہن میں یہ تجویز گردش کر رہی تھی کہ اس مقصد کے لئے ایک علمی مرکز قائم کیا جائے جہاں دینی اور دنیاوی علوم کے ماہرین جمع کئے جائیں جو خورد و نوش کی فکر سے آزاد ہوں تاکہ ایک پُرسکون گوشے میں بیٹھ کر نہایت یکسوئی کے ساتھ اسلام، تاریخ اسلام، تمدنِ اسلام، اسلامی ثقافت کے متعلق ایسی تحقیقی کتابیں مرتب کر سکیں جو دنیائے فکر کیلئے ایک انقلاب برپا کر سکیں۔

کے پرانے عقیدت مند تھے، رسالہ "فکر و نظر" کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"مدت دراز سے ان کے ذہن میں یہ تجویز گردش کر رہی تھی کہ اس مقصد کے لئے ایک علمی مرکز قائم کیا جائے جہاں دینی اور دنیاوی علوم کے ماہرین جمع کئے جائیں، جو خورد و نوش کی فکر سے آزاد ہوں تاکہ ایک پرسکون گوشے میں بیٹھ کر نہایت یکسوئی کے ساتھ اسلام، تاریخ اسلام، تمدنِ اسلام، اسلامی ثقافت کے متعلق ایسی تحقیقی کتابیں مرتب کر سکیں جو دنیائے فکر کے لئے ایک انقلاب برپا کر سکیں۔"

علامہ اقبالؒ اس قسم کے ادارے کے قیام کے لئے کس قدر بے تاب تھے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے چوہدری نیاز علی کے تعاون سے پٹھان کوٹ کے قریب ایک ایسا ادارہ قائم کر دیا اور مولانا مودودیؒ کو حیدرآباد سے پٹھان کوٹ منتقل ہونے کی دعوت دی۔ اور بقول مولانا مودودیؒ انہیں کہا کہ وہ خود بھی سال میں سے چند ماہ وہاں گزارا کریں گے۔ علامہ اقبالؒ کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ پٹھان کوٹ چلے آئے لیکن ان کی منتقلی کے چند ہی روز بعد حضرت علامہؒ کا انتقال ہو گیا۔

پٹھان کوٹ کے اس علمی مرکز نے، جو دارالاسلام کے نام سے موسوم ہوا، علامہ اقبالؒ کے اسلامی تفکر کی

تدوینِ نو کا کام کرانا چاہتے تھے۔ مگر اسلامی فقہ سے حضرت علامہؒ کی کیا مراد تھی اس کا اندازہ محمد احمد خان کے ان انکشافات سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے اپنی کتاب "اقبال اور مسئلہ تعلیم" میں لکھے ہیں:

"جس طرح اقبالؒ دینی اور کلامی مسائل کے لئے "تفکرِ اسلامی" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اسی طرح فقہ سے ان کی مراد روزے نماز کے احکام نہیں ہیں بلکہ اسلام کے جملہ جماعتی عمرانی پہلو ہیں۔ مثلاً سماجی، سیاسی، اقتصادی اور قانونی تعلیم کے امور۔ یعنی وہ چاہتے تھے کہ دورِ حاضر کے تمام عمرانی علوم کے مطالعے کی روشنی میں اسلام کے اجتماعی نظم کی تشریح کی جائے۔"

جس طرح اقبالؒ دینی اور کلامی مسائل کے لئے تفکرِ اسلامی کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں اسی طرح فقہ سے ان کی مراد روزے نماز کے احکام نہیں ہیں بلکہ اسلام کے جملہ اجتماعی عمرانی پہلو ہیں مثلاً سماجی، سیاسی، اقتصادی اور قانونی تعلیم کے امور یعنی وہ چاہتے تھے کہ دورِ حاضر کے تمام عمرانی علوم کے مطالعے کی روشنی میں اسلام کے اجتماعی نظم کی تشریح کی جائے۔

فقہ اسلامی کے بارے میں علامہ اقبالؒ کا یہ نظریہ جو محمد احمد خان صاحب نے مندرجہ بالا الفاظ میں پیش کیا ہے وہ انہوں نے حضرت علامہؒ کے اس تبصرہ سے اخذ کیا ہے جو آپ نے صاحبزادہ آفتاب احمد خان وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے بھیجے ہوئے تعلیمی خاکے پر کیا تھا۔

عصرِ حاضر کی علمی مہمات اور سائنس کے نو بنو انکشافات کے ساتھ ساتھ دنیائے انسانیت کے مسائل بھی روز بروز پیچیدہ تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اجتماعی نوعیت کے ان مسائل پر تحقیق کسی فرد واحد، چاہے علم میں اس کا قد کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، کے بس کا روگ نہیں۔ چنانچہ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں بے شمار ایسے ادارے پائے جاتے ہیں جہاں مختلف علوم و فنون کے ماہرین کو یکجا کر کے مختلف النوع عصری مسائل پر تحقیق کرائی جاتی ہے۔ ایسے ادارے نہ صرف سرکاری شعبے میں پائے جاتے ہیں بلکہ نجی شعبے میں ایسے اداروں کی تعداد کہیں زیادہ ہے اور ان میں سے بعض ادارے تو ایسے ہیں جو اپنے دائرہ کار کے اعتبار سے بین الاقوامی حیثیت اختیار کر گئے ہیں مثلاً امریکہ کے راک فیلر فاؤنڈیشن، فورڈ فاؤنڈیشن اور ایشیا فاؤنڈیشن، اٹلی کا کلب آف روم

وغیرہ لیکن اسلامی دنیا ایسے اداروں کے فقدان سے ابھی تک تہی دامن ہے۔ عالم عرب میں چند ادارے قائم ہوئے ہیں جو ایک نیک شگون ہے لیکن ابھی تک ان اداروں کی کوئی ٹھوس کارگزاری سامنے نہیں آئی۔ خود پاکستان میں بھی ایسے اداروں کی تعداد بہت کم ہے۔

اسی غرض سے انھوں نے ۱۹۶۶ء میں آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگریس کی بنیاد رکھی جس کی غرض و غایت یہ تھی کہ علوم جدید کو مشرف بہ اسلام کیا جائے جس کا طریقہ کار آپ کے نزدیک یہ تھا کہ تمام سائنسی علوم میں تصور توحید کو سمو دیا جائے۔ اس ادارے کے سلسلے میں ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی امداد اور استعانت کے لئے مولانا مودودیؒ نے بعض اہم بین الاقوامی شخصیات کے نام ذاتی خطوط بھی لکھے تھے۔

صلاح الدین صاحب نے محولہ بالا مضمون میں جس دوسرے اسلامی مفکر یعنی ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا ذکر کیا ہے انھوں نے اپنے کام کو فکر اقبال کی توضیح سے موسوم کیا تھا۔ وہ خود بھی ایسے ادارے کے قیام کی شدید خواہش رکھتے تھے جہاں دور حاضر کے مسائل کی گتھیاں سلجھائی جا سکیں۔ اس غرض سے انھوں نے ۱۹۶۶ء میں آل پاکستان اسلامی ایجوکیشن کانگریس کی بنیاد رکھی جس کی غرض و غایت یہ تھی کہ علوم جدید کو مشرف بہ اسلام کیا جائے جس کا طریقہ کار آپ کے نزدیک یہ تھا کہ تمام سائنسی علوم میں تصور توحید کو سمو دیا جائے۔ اس ادارے کے سلسلے میں ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی امداد اور استعانت کے لئے مولانا مودودیؒ نے بعض اہم بین الاقوامی شخصیات کے نام ذاتی خطوط بھی لکھے تھے۔ ڈاکٹر رفیع الدین ۱۹۶۹ء میں کراچی میں ایک ٹریفک کے حادثے میں جاں بحق ہو گئے اور اس طرح یہ ادارہ ایک انتہائی ذہین شخصیت کی انتہائی فعال قیادت سے محروم ہو گیا۔ ان کا قائم کردہ ادارہ اگرچہ قائم ہے لیکن اپنے محدود وسائل اور دیگر وجوہ کی بنا پر وہ مقاصد پورے نہ کر سکا جو اس کے پیش نظر تھے۔ حال ہی میں انہی مقاصد کے حصول کے لئے امریکہ میں ایک ادارہ "انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک تھاٹ" قائم ہوا ہے جس کے سربراہ

بنگالی ڈاکٹر اسمٰعیل الفاروقی ہیں۔ انھوں نے توحید کے موضوع پر ایک نہایت عمدہ کتاب بھی تصنیف کی ہے جسے ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی کتاب "آئیڈیالوجی آف دی فیوچر" کا تکملہ کہا جا سکتا ہے۔

پاکستان میں آل پاکستان ایجوکیشن کانگریس کے علاوہ ایک ادارہ معارف اسلامی بھی ہے جس کی شاخیں لاہور اور کراچی میں کام کر رہی ہیں۔ اس ادارے کی بنیاد خود مولانا مودودیؒ نے رکھی تھی۔ اسی طرح پروفیسر خورشید احمد صاحب نے اسلام آباد میں "انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز" قائم کیا ہے جس کے اغراض و مقاصد بھی بڑے ہی بہت بلند و بالا ہیں۔ اس سے پہلے پروفیسر خورشید احمد صاحب لندن میں ایک ادارہ اسلامک فاؤنڈیشن کے نام سے قائم کر چکے ہیں جو مضبوط بنیادوں پر کھڑا ہے اور نہایت مفید کام کر رہا ہے۔ اسی سال اردو ڈائجسٹ کے زیر اہتمام قومی یکجہتی کے موضوع پر لاہور میں منعقدہ ایک سیمینار کے اختتامی اجلاس میں پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف نیشنل افیئرز قائم کرنے کا اعلان کیا گیا ہے جس کا بڑی شدت سے انتظار کیا جا رہا ہے۔

اس ساری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ عصر حاضر کے تقاضوں کے بارے میں جو فکرمندی علامہ اقبال کو تھی اور اس سے نمٹنے کے لئے جس قسم کے اداروں کے قیام کو وہ ضروری سمجھتے تھے اس کے پیش نظر ہمارا یہ قومی فریضہ ہے کہ ایسے اداروں پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے اور انھیں زیادہ سے زیادہ فعال بنانے کی فکر کی جائے تاکہ ہم ان تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکیں جو اس وقت عالم اسلام کو درپیش ہیں۔ (اردو ڈائجسٹ)

بقیہ: اداریہ :- ربیع الاول کا مہینہ اس حیثیت سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اسی میں آپ تشریف لائے اور اسی میں ہم آپ کی سیرت کا ذکر دوسرے مہینوں سے زیادہ کرتے ہیں۔ جلسے اور اجتماعات منعقد کرتے ہیں لیکن اس میں بھی تصنع و ریاکاری اور دکھاوے کے پہلو زیادہ ہی سامنے آتے ہیں۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ اس سے اتباع سنت اور عمل کا جذبہ کم ہی پیدا ہوتا ہے۔ یہ چیز تو ہمارے شایان شان ہے کہ اس ہستی کے حسن سیرت و کردار کو ہم متعارف کراتے ہیں۔ ہمارے ہاں قول سے زیادہ عمل کی اہمیت ہے اور تصنع و ریاکاری سے زیادہ حقیقت کی۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ جس رہنما کی سیرت ہم دوسروں کے سامنے نمونے کے طور پر پیش کر رہے ہیں اس سے خود ہماری زندگی تہی دامن ہو۔ اگر ایسا ہے تو یہ ایک زبردست تضاد ہے جسکی تلافی نعتوں کے قصیدے اور لاؤڈ سپیکر کے ہنگامے نہیں کر سکتے۔ وہ تو صرف اسی وقت دور ہو سکتا ہے جب ہم حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا چلتا پھرتا نمونہ بن جائیں اور ہم آپ کی سیرت و کردار سے متصف ہو جائیں۔ اے کاش ہمیں اس کی توفیق مل جائے۔

طارق نثار خطیب فلاکر

۱۹۸۷/۱۱/۱۲

توقیر عالم فلاحی ۔ علی گڑھ

تصورِ آخرت ...... انسانیت کی معراج

خدائے ذوالجلال کی اس زمین پر مختلف اذہان وقلوب کے لوگ رہتے بستے ہیں اور اپنے ذہن و فکر کے مطابق اپنی سرگرمئ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کوئی طریقۂ زندگی اپنے ماننے والوں کو یہ سبق دیتا ہے کہ اس موجودہ زندگی کے بعد اپنے فعل وعمل کے مطابق انسان دنیا میں بار بار جنم لیتا ہے۔ دوسرا طرزِ فکر اس سلسلے میں یہ ہے کہ بس یہ دنیا ہی سب کچھ ہے، یہاں جو جیسا کرتا ہے پالیتا ہے، اس کے بعد کسی ابدی زندگی کا تصور ایک بے معنی خواب ہے۔

دوسری زندگی کے بارے میں سوچنے کے یہ مختلف انداز اس وجہ سے ہیں کہ ان کے حاملین خالقِ حقیقی اور پروردگارِ عالم کے سلسلے میں کوئی واضح اور قطعی طرزِ فکر اپنانے سے گریز کی راہیں اختیار کرتے ہیں۔ کائنات کی وسعت، ہمہ گیری اور اس کے نظم و ربط پر غور و فکر کرنے سے کتراتے ہیں۔ تعصب، بیجا حمایت، آبا پرستی اور حقائق سے گریز یہ تمام ایسے امراض ہیں جو نوعِ بشری کو شاہراہِ مستقیم پر گامزن رکھنے اور ہمہ گیر قوتِ فکر پیدا کرنے کی بجائے بھول بھلیوں میں بھٹکا دیتے ہیں چنانچہ جب دوسرے جہان کے سلسلے میں ذہنوں میں ایک دھندلا تصور نقش کر جاتا ہے اور خدا و رسول اور آخرت یہ حقائق معمہ بن جاتے ہیں۔

وقوعِ آخرت ایمان کا جزو ہے اسلام جو آیاتِ حقیقی کی جانب سے نوعِ انسانی کیلئے بیش قیمت سرمایۂ حیات ہے وہ ان حقائق کے سلسلے میں ایک روشن تصور دیتا ہے تاکہ خدائی ضابطۂ حیات میں کوئی ایسا نقص نہ پایا جائے جس کی بنا پر دینِ خداوندی کے سلسلے میں کسی طرح کی بدگمانی ہو اور یہ دین جو سراسر رحمت و رافت ہے وہ زحمت و کلفت بن جائے اسی لئے اول میں یہ وجہ بتاتا ہے کہ انسان فوز و فلاح کی اصل منزل تک رسائی کے لئے اپنی زندگی کے سفر کا آغاز ایک صحیح توشہ کی فراہمی کے بعد ہی کرے۔ اس کے بغیر صحیح سمتِ سفر متعین کرنا بھی مشکل ہے۔ [illegible] حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ اللہ

عزوجل کی ذات پر اس کی تمام صفات و کمالات کے ساتھ ایمان و یقین ہو۔ اسی لئے وقوعِ آخرت کا یقین بھی اس ایمانِ کامل کا ایک لازمی جزو ٹھہرتا ہے، کیونکہ پوری کائنات کا مالک عدل و انصاف کی صفت سے خالی نہیں رہ سکتا۔ یہ تو سراسر ظلم ہوگا کہ کوئی ایسا دن نہ آئے جو اللہ کے نیک اور مخلص بندوں کے لئے مسرت و خوشی کا پروانہ لائے، اور اللہ کے باغیوں کے لئے وجہِ سرزنش یا عذاب ثابت ہو۔ نیکوکاروں کے لئے مسرت و شادمانی کا کوئی نہ کوئی دن آنا ہی چاہیے اور بدکاروں کی سرزنش کے لئے کوئی نہ کوئی عدالت قائم ہونی ہی چاہیے۔ لیکن اس دنیا کے اندر کوئی ایسی عدلیہ قائم نہیں ہو سکتی جو بے کم و کاست حقداروں کو حق دے دے، اور ظالموں کو ان کے کرتوتوں کا بدلہ دیدے۔ اس زمین پر حقیقی خوشی کا حصول ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ محض ایک دعویٰ اور خود ساختہ خیال نہیں ہے بلکہ اس پر شب و روز کے عینی مشاہدات ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ خالقِ کائنات اپنی کتابِ عزیز میں متعدد مقامات پر یوم الجزاء کے وقوع پذیر ہونے کا اصل مقصد یہی بتاتا ہے کہ نیکوکاروں کو ان کے اعمال و افعال کا صلہ دیا جائے تاکہ انہیں ندامت و شرمندگی نہ ہو اور وہ ابدی سرور حاصل کرلیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان لاعیش الا عیش الآخرۃ اسی حقیقت کا غماز ہے۔ جناب مولانا وحیدالدین خانصاحب اس سلسلے میں اپنی شہرت یافتہ تصنیف "علم جدید کا چیلنج" میں لکھتے ہیں، "بیشک آج کا مزدور پہلے کے مزدور کے مقابلے میں زیادہ اجرت پاتا ہے لیکن جہاں تک حقیقی خوشی کی دولت کا تعلق ہے اس معاملے میں وہ اپنے پیش روؤں سے بھی زیادہ محروم ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے جو نظام بنایا ہے وہ کچھ مادی ظواہر انسان کو دیدے مگر خوشی اور اطمینان کی دولت پھر بھی اسے نہیں دیتا۔" ملاحظہ فرمائیں صفحہ ۱۰۔

> شب و روز کے تجربات اور عینی مشاہدات کی بنا پر یہ امر ایک ثابت شدہ حقیقت بن گیا ہے۔ اس کے اعتراف سے غیر مسلم علماء کی زبانیں بھی خاموش نہ رہ سکیں۔ جناب بلیک کے الفاظ دیکھیں وہ کہتے ہیں: A MARK IN EVERY FACE I MEET. MARK OF WEEKNESS MARKS OF WOW ترجمہ: ہر وہ صورت جو میرے سامنے آتی ہے اس پر ضعف و کمزوری اور حزن و غم کے نشانات ہوتے ہیں
>
> (بحوالہ علم جدید کا چیلنج)

برٹرینڈ رسل نے یہ اعتراف کیا ہے کہ ہماری دنیا کے جانور خوش ہیں۔ انسانوں کو بھی خوش ہونا چاہئے مگر جدید دنیا میں انھیں یہ نعمت حاصل نہیں۔ مسٹر رسل کے بیان کی روشنی میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا حصول ممکن ہی نہیں، الفاظ دیکھیں

HAPPINESS IN THE MODERN WORLD HAS BECOME IMPOSSIBILITY

(حوالہ مذکورہ بالا صفحہ ۱۱۵)

تصور آخرت کے بغیر وہ لوگ جو اس چند روزہ زندگی کے بعد کسی ابدی اور لازوال زندگی کے قائل نہیں ہیں، وہ اپنے قول و عمل، حیات بصیرت، روش و حرکت سے اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ انسانیت کا جوہر ان کے اندر موجود نہیں ہے۔ اگرچہ گوشت و پوست سے بھرے ہوئے تو تاہم دوسرے افراد کے لئے نیز دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقت میں بشر دوستی اور انسانیت نوازی کے مظاہرے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ حق ناحق، خیر و شر، نیک و غلط اور مستحسن و قبیح میں تمیز کئے بغیر دنیا کے سرو سامان کو خوان یغما سمجھ بیٹھے ہیں اور بنی نوع انسان کے اسباب و وسائل پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں۔ انسانی جان قدر و احترام کے قابل نہیں سمجھی جاتی ہے۔ اور بلا تذبذب خونخوار درندوں کی طرح ان کی جانوں کو لقمۂ تر بنایا جاتا ہے۔ کیونکہ ان کے سامنے eat drink and be merry یا ہر ممکن کوشش کر کے تمام دوبارہ حیات کا فلسفۂ زندگی موجود ہوتا ہے۔ عقیدۂ آخرت سے بیزاری دنیا کو اضطراب و بے چینی، سراسیمگی، وحشت اور زحمت و کلفت کا اکھاڑہ بنا دیتی ہے انسانیت کا جامۂ شرف تار تار کر دیا جاتا ہے اور حقوق العباد ان کے سامنے پاگلوں کی بڑ نظر آتی ہے غرضیکہ انسانیت کا امن و سکون غارت ہو جاتا ہے اور پوری زندگی مخدوش ہو جاتی ہے۔

آخرت فراموشی کا سبب :- مندرجہ بالا وضاحت سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ آخرت فراموشی ایک ایسا مرض ہے جو قوت فکر و عمل کو شل کر دیتا ہے۔ اس کی شبانہ روز سرگرمیوں اور مصروفیتوں میں حیات بعد الممات کی کوئی جھلک نہیں ملتی، اس عقیدۂ آخرت سے انحراف کی روش اختیار کر کے وہ اسباب دنیا کو اپنی نفسانی خواہشات کا ہدف بنا کر اس کے حصول کے لئے سرگرم سفر رہتا ہے۔ اس طرح اس زندگی کی رعنائی و دلکشی سے مسحور ہو کر اپنے حقیقی سرمایۂ حیات کو فراموش کر جاتا ہے۔ جب یہ آخرت فراموشی ایک ایسا زہر ہے جو نوع بشری کی پوری زندگی کو مسموم بنا دیتا ہے تو اس کا سبب معلوم کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کوئی سبب و فکر سے پہلے اپنی خیر و فلاح کی طرف متوجہ زندگی

کا ثبوت ہوگا اور دوسری طرف آدم و حوا کی اولاد کے دکھوں کا علاج ہوگا۔

یہ ایک نفسی بات ہے کہ دو چیزوں میں جو چیز کسی کے نزدیک زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہے وہ اس کے لئے خاص توجہات کی طالب ہوتی ہے۔ دنیا اگر زیادہ قدر و قیمت کی چیز معلوم ہو تب تو اس کی تمام دلچسپیاں اسے اپنے حیطۂ اختیار میں کر لیتی ہیں۔ دنیا کی چاہ و محبت ہی وہ خاص سبب ہے جو عقیدۂ آخرت سے دور اور لازوال زندگی کی مسرتوں سے محروم کر دیتا ہے۔ اور یہی وہ محبت دنیا ہے جو اولاد آدم کو انسان نما درندہ بنا دیتی ہے۔ خالق کائنات نے اپنی کتاب عزیز قرآن مجید کے اندر اس حقیقت کی تذکیر یوں کرائی ہے۔ اِنَّ هٰؤُلَاءِ يُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُونَ وَرَاءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيلًا۔ ترجمہ: یقیناً یہ لوگ اس دنیا کو عزیز رکھتے ہیں اور ایک بھاری دن کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ جو چیز قدر و منزلت اور مقام و حیثیت کے اعتبار سے نظروں میں گھر کر جاتی ہے وہ قابل ذکر التفات و توجہ کا ہدف بن جاتی ہے۔ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس فرمودات کی روشنی میں یہ حقیقت تشنۂ وضاحت نہیں رہتی کہ دنیا سے محبت اور موت سے ڈر انسان کو اس کی حیثیت سے گرا دیتا ہے۔ مولانا صدر الدین صاحب اصلاحی فرماتے ہیں کہ اگر وہ ایسا منکر اسلام ہے جو آخرت کا بھی منکر ہے تو جب تک حُبّ دنیا کے زہر سے اس کا دل و دماغ مسموم ہے، اس پر جزا و سزا کے دلائل ہرگز کارگر نہیں ہو سکتے ......

یہ بات کہ دنیا کے پیچھے بھاگنے والا آخرت کا جویا نہیں بن سکتا، کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے۔ انسانی فطرت کا یہ ایک کھلا ہوا راز ہے کہ وہ جس چیز سے محبت کرتا ہے، اس کی مخالف چیزوں کا نام بھی سننا گوارہ نہیں کرتا۔ دنیا پرستی اور آخرت پرستی ایک دوسرے کی ضد ہیں، ان میں سے ایک کا وجود دوسرے کے وجود کا فطری دشمن ہے۔ اس لئے یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جس کے سینے میں دنیا کی محبت بسیرا لئے رہتی ہو وہاں آخرت کا طائر قدس اُتر کے اپنا آشیانہ نہیں بنا سکتا۔

"اساس دین کی تعمیر"

تصور آخرت کے بعد مندرجہ بالا وضاحت سے یہ بات اب کھل کر سامنے آگئی کہ جن کے دل و دماغ موت کے بعد دوسری زندگی کے تصور سے خالی ہوتے ہیں وہ دنیا کو ہی سب کچھ سمجھ کر اپنی زندگی کی گاڑی کو حرکت دیتے ہیں اور وہ اپنے سامنے "جہاں [illegible] ہے غیرت نے تو نہیں جہاں

کرنے کی اس تعلیم کو پیش نظر رکھکر ہی تا عمر سرگرمیوں کا رُخ متعین کرتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جن کے قلب و ضمیر کا ایک ایک ریشہ مدبر کائنات کے خوف و خشیت سے لرزیدہ ہوتا ہے اور جن کی زندگیوں کا ہر شعبہ حق و صداقت کی کرنوں سے منور ہوتا ہے وہ لوگ اپنے سامنے زندگی کا ایک فلسفہ رکھتے ہیں۔ وہ یقین کی حد تک جانتے ہیں کہ یہ دنیا اور اس کے اسباب و علل عارضی ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس دنیا کی زندگی میں نیکی کا اجر اور بدی کا بدلہ نہیں مل سکتا۔ انکے سامنے یہ تعلیم ہر وقت ہوتی ہے کہ اس دنیا کی زندگی میں جو کچھ ملتا ہے وہ بطور آزمائش ملتا ہے جس کے حصول کے بعد اختیار و آزمائش کا مرحلہ طے کرنا ابھی مقدر ہوتا ہے۔ ان روشن تصورات کی آبیاری کے بعد وہ لبادۂ انسانیت کو پل بھر کے لئے بھی تار تار گوارا نہیں کرتے، دوسروں کے حقوق پر کبھی دست درازی نہیں کرتے، ظلم و عدوان، اور بغاوت و سرکشی نام کی کوئی چیز ان کے گوشۂ ذہن میں موجود نہیں ہوتی، مصائب و مشکلات میں دوسروں کا سہارا اور غمگسار رہتے ہیں۔ انسانیت نواز اور بشر دوست ہوتے ہیں، دنیا کی رنگینیوں سے گریز اختیار کرنے والے اور آخرت کی لازوال کامیابی پر توجہات کو مرکوز کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ دنیا کی اس چند روزہ زندگی کو اضطرار و تکلف کی مجبوری سمجھتے ہیں۔ اختیار و پسند کی کوئی چیز نہیں۔ انکے سامنے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے، یہ عقیدہ کسی کی زندگی کو انقلاب آشنا کر دیتا ہے۔ چنانچہ یہ دنیا امن و سکون اور عدل و انصاف کا گہوارہ بن جاتی ہے کیونکہ اس تصور آخرت کی آبیاری کے بعد اُسے حیات ابدی کی ضمانت مل جاتی ہے۔ سید قطب شہید رحمۃ اللہ علیہ اپنی شاہکار تصنیف میں فرماتے ہیں "آخرت کا خیال انسان کو ایک فرحت کا احساس تحفظ بخشتا ہے اسے حیات دوام کی نوید سناتا ہے۔ اس کے بعد انسان کو اس یقین کی ضمانت مل جاتی ہے کہ وہ جسمانی موت کے ساتھ وہ نیست و نابود نہیں ہو جائے گا۔ نہ کارزار حیات میں اسکا جہاد مسلسل بے ثمر رہے گا بلکہ اس کو اگر اس کا صلہ اس دنیا میں نہ ملا تو آنے والی زندگی میں تو بہر حال مل کر رہیگا۔"

(اسلام اور جدید ذہن کے شبہات صفحہ ۲۲)

مذکورہ بالا تشریحات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تصور آخرت سے جتنی غفلت و بے التفاتی برتی جائے گی اس کے مطابق انسانیت کا جوہر تابان ختم ہوتا جائے گا۔ ایسے لوگ

(باقی صفحہ پر)

عزیز احمد ملک فلاحی
کرلا ممبئی

تقویٰ

تقویٰ تمام اسلامی تعلیمات کا محور و مرکز ہے۔ پوری شریعت کی غرض و غایت ہے۔ تمام عبادات کا مقصود ہے۔ قرآن میں تمام انبیاء کا مشن تقویٰ ہی بتایا گیا ہے۔ سورہ شعراء میں حضرت نوحؑ کی دعوت یہ بتائی گئی ہے:

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۔ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۔ / الشعراء ۱۰۶ تا ۱۰۸	ترجمہ: یاد کرو جب کہ ان کے بھائی نوحؑ نے ان سے کہا تھا "کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ میں تمہارے لئے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

اسی سورہ میں حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت کا تعارف یوں کرایا گیا ہے:

اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۔ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوْنِ ۔ / الشعراء / ۱۲۴ تا ۱۲۶	ترجمہ: یاد کرو جب کہ ان کے بھائی ہود نے ان سے کہا تھا "کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟" میں تمہارے لئے ایک امانت دار رسول ہوں۔ لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

اسی سورہ میں حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے لئے یہی جملے آئے ہیں تقویٰ ہی پر ہدایت کو انحصار ہے جیسا کہ فرمایا:

هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ / سورہ بقرہ / ۲	ترجمہ: ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کیلئے۔

جنت متقیوں کیلئے ہے، فرمایا:

سَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ۔ / آل عمران / ۱۳۳	ترجمہ: دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جسکی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے، وہ اللہ …

ان خدا ترس لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے

دوسری جگہ فرمایا:

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ ۝ آخِذِينَ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَٰلِكَ مُحْسِنِينَ ۝ / الذاریات / ۱۵ تا ۱۶

ترجمہ۔ البتہ متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے جو کچھ ان کا رب انہیں دیگا اسے خوشی خوشی لے رہے ہوں گے وہ اس دن کے آنے سے پہلے نیکو کار تھے۔

اللہ نے متقیوں کو اپنا محبوب بتایا ہے۔ فرمایا:

بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ۝ / آل عمران / ۷۶

ترجمہ۔ جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور برائی سے بچ کر رہے گا، وہ اللہ کا محبوب ہوگا

غرض تقویٰ ایک ایسی جامع صفت ہے جو ہدایت کا ذریعہ ہے عبادات کا مقصد و مطلوب اور جنت میں لے جانے والی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس کو صحیح طور سے سمجھا جائے اس کو اس کی پوری شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔

معنی

اس کا مادہ "وق ی" ہے جس کے معنی لغت میں "بچانا" اور "محفوظ کرنا" کے آتے ہیں یہ فعل متعدی ہے، اس کا دو مفعول بھی آتا ہے یعنی کسی کو کسی چیز سے بچانا اور محفوظ رکھنا۔ مثلاً:

قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا / التحریم / ۶

ترجمہ۔ بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو اس آگ سے۔

وقی اور اتقاء سب اسی کے خاندان کے الفاظ ہیں۔ تقویٰ وقی کا اسم ہے یہ اصلاً وقوی تھا۔ تقویٰ کے مفہوم کا بنیادی عنصر گو کہ "ڈرنا" بھی ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ صرف ڈرنا ہی ہے بلکہ ڈر کر بچنا اور محفوظ رکھنا بھی ہے۔ اسی وجہ سے یہ لفظ اپنے مترادفات سے منفرد و ممتاز ہوتا ہے مثلاً خوف، خشیت، رہبت، رہیت وغیرہ۔ ان سب میں ڈرنا قدر مشترک ہے لیکن تقویٰ ان سب سے اس پہلو سے الگ ہے کہ اس میں ڈرنے کے ساتھ ساتھ اس سے بچنے اور محفوظ رکھنے کا بھی معنی پایا جاتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ یہ لفظ صرف بچنے ہی کے

معنی میں استعمال ہوتا ہے ذیل کی آیتیں ملاحظہ ہوں:

فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا / المزمل / ۱۷

ترجمہ۔ اگر تم ماننے سے انکار کرو گے تو اس دن کیسے بچ جاؤ گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔

وَمَنْ يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ / النور / ۵۲

ترجمہ۔ ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں اور کامیاب وہی ہیں جو اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کریں اور اللہ سے ڈریں اور اس کی نافرمانی سے بچیں۔

تقویٰ ایک اصطلاح

تقویٰ کے معنی و مفہوم کی تعیین کے لئے تو بیشک لغت کافی ہے لیکن اصطلاحی تقویٰ کی تشریح صرف لغت سے نہیں ہو سکتی ہے اس کے لئے ہمیں ان ماخذ کی طرف رجوع کرنا ہوگا جن میں یہ اصطلاح استعمال کی گئی ہو۔ یہ ماخذ صرف قرآن اور حدیث ہیں ان کے علاوہ دوسری چیزوں سے تائید تو حاصل کی جا سکتی ہے لیکن مفہوم کی تعیین میں انھیں بنیادی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔

قرآن و حدیث کے مطالعہ سے تقویٰ کی جو صورت سامنے آتی ہے وہ پوری زندگی کو محیط اور زندگی کے سارے گوشوں پر حاوی ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے تقویٰ ایک خاص انداز زندگی سے عبارت نظر آتا ہے۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں تقویٰ ایک ایسا فریم نظر آتا ہے جس میں انسانی زندگی اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ بالکل فٹ نظر آتی ہے۔ غور و فکر، علم و عمل، عبادات و اخلاق، معاملات و مسائل، معاشرتی و تمدنی، انفرادی و اجتماعی تعلقات، اقتصادیات و سیاسیات حتیٰ کہ بین الاقوامی روابط و امور بھی اس کے دائرۂ اثر میں دکھائی دیتے ہیں۔

وَالَّذِي جَاءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ / الزمر / ۳۳

اور جو شخص سچائی لے کر آیا اور جنہوں نے اس کو سچ مانا وہی عذاب سے بچنے والے ہیں۔

اس آیت میں ان لوگوں کو متقی کہا گیا ہے جو رسول پر اور اس کی لائی ہوئی کتاب پر ایمان

لائے اور اس کی تصدیق بھی کی یہی بات دوسری آیت میں کہی گئی ہے۔

يايها الذين آمنوا اتقوا الله وآمنوا برسوله / الحدید/۲۸

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول (محمد) پر ایمان لاؤ۔

صرف عقائد و ایمانیات ہی نہیں عبادات و اعمال بھی تقویٰ سے ہم رشتہ ہیں فرمایا۔

• يايها الذين آمنوا كتب عليكم الصيام كما كتب على الذين من قبلكم لعلكم تتقون۔ / البقرہ/۱۸۳

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم پر روزے فرض کر دیئے گئے جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیروؤں پر فرض کئے گئے تھے اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی۔

اسی طرح ایک دوسری آیت:

الحج اشهر معلومات فمن فرض فيهن الحج فلا رفث ولا فسوق ولا جدال في الحج وما تفعلوا من خير يعلمه الله وتزودوا فان خير الزاد التقوى / بقرہ/۱۹۷

حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں جو شخص ان مقرر مہینوں میں حج کی نیت کرے، اسے خبردار رہنا چاہیے کہ حج کے دوران میں اس سے کوئی شہوانی فعل، کوئی بدعملی، کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو اور جو نیک کام تم کرو گے وہ اللہ کے علم میں ہوگا۔ سفر حج کے لئے زادِ راہ ساتھ لے جاؤ اور سب سے زیادہ بہتر زادِ راہ پرہیزگاری ہے۔

بڑوں کا احترام اور معاشرتی زندگی کے آداب بھی اس کے دائرے میں آتے ہیں

يايها الذين آمنوا اتقوا الله وقولوا قولا سديدا / احزاب ۷۰

اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کیا کرو۔

سورہ حجرات میں فرمایا:

ان الذين يغضون اصواتهم

جو لوگ رسول خدا کے حضور بات کرتے ہوئے

عند رسول الله اولئك الذين امتحن الله قلوبهم للتقوى / حجرات/۳

اپنی آواز پست رکھتے ہیں، وہ درحقیقت وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کیلئے جانچ لیا ہے۔

آپس میں میل محبت سے رہنا دوسروں کو معاف کر دینا اور معاملات میں عدل پر قائم رہنا بھی تقویٰ قرار دیا۔

فاتقوا الله واصلحوا ذات بينكم / انفال/۱

پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور اپنے آپس کے تعلقات درست کرو۔ دوسری جگہ فرمایا۔

وان تعفوا اقرب للتقوى / البقرۃ/۲۳۷

نرمی سے کام لو تو یہ تقویٰ سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

اسی طرح سورہ مائدہ میں:

اعدلوا هو اقرب للتقوى / المائدہ/۸

عدل کرو یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

ایک انسان کو معاشرے میں دوسرے لوگوں کے ساتھ کیا رویہ اپنانا چاہیے ان کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کرنا چاہیے تقویٰ کی نظر میں یہ ہے

يايها الذين آمنوا اجتنبوا كثيرا من الظن ان بعض الظن اثم ولا تجسسوا ولا يغتب بعضكم بعضا ايحب احدكم ان ياكل لحم اخيه ميتا فكرهتموه واتقوا الله ان الله تواب رحيم / الحجرات/۱۲

اے لوگو جو ایمان لائے ہو بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں تجسس نہ کرو، اور تم میں سے کوئی غیبت نہ کرے کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا، دیکھو تم اس سے گھن کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو، اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے

دوسری جگہ مطلقات کے بارے میں فرمایا:

وللمطلقات متاع بالمعروف

اسی طرح جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو

حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۔

/ البقرہ / ۲۴۱ /

اور انہیں بھی مناسب طور پر کچھ دے کر رخصت کیا جائے، یہ حق ہے متقی لوگوں پر۔

معاشی دوڑ دھوپ میں کون سی روش تقویٰ کی روش ہے قرآن اس پر روشنی ڈالتا ہے۔

لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

/ آل عمران / ۱۳۰

یہ بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرو امید ہے کہ فلاح پاؤ گے

سیاست و حکومت اور بین الاقوامی مسائل بھی تقویٰ کے دائرے میں آتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ

/ الحجرات / ۱۰

مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہذا اپنے بھائی کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے۔

دوسری آیت جو معاملہ فوجداری میں تقویٰ کی روش کی نشاندھی کرتی ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۔

/ البقرہ / ۱۷۹

تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے امید ہے کہ تم اس قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو۔

دوسری جگہ فرمایا

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا عَلَي الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَي الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ

اور دیکھو ایک گروہ نے جو تمہارے لیے مسجد حرام کا راستہ بند کر دیا، تو اس پر تمہارا غصہ تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم بھی ان کے مقابلے میں نا روا

وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۔

/ المائدہ / ۲

زیادتیاں کرنے لگو نہیں جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو۔ اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اللہ سے ڈرو اس کی سزا بہت سخت ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے ایک روایت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت میں تقویٰ کا کیا مقام ہے۔

عن معاویة قال قال رسول الله یا معاویة ان ولیت امرا فاتق الله واعدل ۔

/ مشکوٰۃ

معاویہ سے مروی ہے انہوں نے کہا کہ رسول اللہ نے فرمایا اگر تم پر کوئی ذمہ داری ڈالی جائے تو اللہ سے ڈرو اور انصاف کرو۔

اللہ کی راہ میں جہاد، اقامت دین کیلئے تگ و دو اور دعوت و تبلیغ کی راہ میں سعی و کوشش بھی تقویٰ کے دائرے سے باہر نہیں۔ فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاۗءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓي اَلَّا تَعْدِلُوْا ۭ اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۔

/ المائدہ / ۸

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

لَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ

جو لوگ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ تو کبھی تم سے یہ درخواست نہ کریں گے کہ انہیں اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے سے معاف رکھا جائے

عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ / التوبۃ / ۴۴

اللہ متقیوں کو خوب جانتا ہے

سورہ تغابن میں ہے:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا وَأَنْفِقُوا خَيْرًا لِأَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۔

/ تغابن / ۱۶

لہٰذا جہاں تک تمہارے بس میں ہو اللہ سے ڈرتے رہو اور سنو اور اطاعت کرو اور اپنے مال کو خرچ کرو یہ تمہارے ہی لئے بہتر ہے جو اپنے دل کی تنگی سے محفوظ رہ گئے وہی فلاح پانے والے ہیں۔

یہ ہے اصطلاحی تقویٰ کا وسیع اور ہمہ گیر تصور جو پوری زندگی خواہ وہ خارجی ہو یا داخلی، اعضاء و جوارح سے تعلق رکھتی ہو یا خیالات اور جذبات سے، انفرادی ہو کہ اجتماعی، ملک گیر ہو کہ بین الاقوامی غرض یہ کہ تمام شعبِ حیات کو محیط ہے

متقین کی صفات

قرآن نے متقین کی صفات بھی گنائی ہیں جو نہایت جامع ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ متقی کیسا ہوتا ہے سورہ بقرہ کے شروع ہی میں فرمایا:

الٓمٓ ۔ ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۔ وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۔

/ البقرہ / ۱ تا ۴

الف لام میم یہ اللہ کی کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں، ہدایت ان پرہیزگار لوگوں کے لئے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں جو کتاب تم پر نازل کی گئی ہے (یعنی قرآن) اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئیں تھیں ان سب پر ایمان لاتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

ان آیات میں متقین کی صفت بتاتے ہوئے تمام اساسی عقائد کا ذکر کر دیا جس سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ کی پہلی منزل عقائد کی درستگی اور ان میں رسوخ پیدا کرنا ہے اس کے بغیر تقویٰ کا تصور ہی مہمل ہے۔ اسی سورہ میں دوسری جگہ فرمایا:

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلٰئِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلٰوةَ وَآتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ۔

/ البقرۃ / ۱۷۷

نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لئے یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر اور ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں اور یتیموں پر مسکینوں اور مسافروں پر مدد کیلئے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ اور نیک وہ لوگ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں یہ ہیں راستباز لوگ اور یہی لوگ متقی ہیں۔

سورہ آل عمران میں متقین کی صفات کا تذکرہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ متقین زندگی کے ہر معاملہ میں ایک خاص روش اختیار کرتے ہیں، ایسا نہیں ہے کہ وہ ایک مخصوص دائرہ میں تو متقی رہیں اور اس کے باہر جا کر عام لوگوں میں اس طرح گھل مل جائیں کہ ان کی کوئی امتیازی خصوصیت نہ ظاہر ہو۔ فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبٰوا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۔ وَاتَّقُوا

اے لوگو جو ایمان لائے ہو یہ بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرو امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ اس آگ سے

النار التی اُعدت للکفرین واطیعوا
اللّٰہ والرسول لعلکم ترحمون ۔
وسارعوا الی مغفرۃ من ربکم
جنۃ عرضھا السمٰوٰت والارض
اُعدت للمتقین ۔ الذین ینفقون
فی السراء والضراء والکاظمین الغیظ
والعافین عن الناس واللّٰہ یُحِبُّ
المحسنین ۔ والذین اذا فعلوا فاحشۃ
او ظلموا انفسھم ذکروا اللّٰہ فاستغفروا
لذنوبھم ومن یغفر الذنوب
الا اللّٰہ ولم یُصِرُّوا علی ما فعلوا
وھم یعلمون ۔

آل عمران / ۱۳۱ تا ۱۳۵

بچو جو کافروں کے لئے مہیا کی گئی ہے اللہ اور رسول کی اطاعت کرو ، توقع ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا ، دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کیطرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے اور وہ ان خدا ترس لوگوں کیلئے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بدحال ہوں یا خوشحال جو غصے کو پی جاتے ہیں ، اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں ، تو معاً اللہ انہیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں ، کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو ، اور وہ کبھی دانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے ۔"

یہ ہے وہ آئینہ جس میں متقی کی پوری تصویر دیکھی جا سکتی ہے ۔ اس کی خلوت و جلوت ، اس کی پسند و ناپسند ، اس کا قانون اخذ و ترک ، دوسروں کے تعلقات کی نوعیت ، انکے ذات کا ہمہ آن احتساب خوشی ہو کہ غمی ، فارغ البالی ہو یا پریشانی ، اس کی چال ڈھال ، اس کی نشست و برخاست غرض یہ کہ اسکی زندگی کا ایک ایک لمحہ کس انداز سے گزرتا ہے ان آیتوں سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ اسی کی جامع تعبیر ہے وہ آیت جس میں تقویٰ کو لباس کہا گیا ہے :

ولباس التقوی ذالک خیر ۔ الاعراف / ۲۶
اور بہترین لباس تقویٰ کا لباس ہے

مدارج تقویٰ

تقویٰ کے تین مدارج ہیں : پہلا یہ کہ آدمی محرمات سے بچے اور فرائض کی ادائیگی مستعدی سے کرے ۔ ذیل کی حدیث سے یہی معلوم ہوتا ہے :

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من یاخذ عنی ھذہ الکلمات فیعمل بھن قلت انا یا رسول اللّٰہ فاخذ بیدی وعد خمسا فقال اتق المحارم تکن اعبد الناس ۔ مشکوٰۃ ۔ بحوالہ ترمذی

تقویٰ کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی ان اعمال سے اجتناب کرنے لگے جو شریعت نے مکروہ ٹھہرائے ہیں ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے یہی ثابت ہوتا ہے :

الحلال بین والحرام بین وبینھما مشتبھات لا یعلمھا کثیر من الناس فمن اتقی المشبھات استبرا لدینہ وعرضہ ومن وقع فی الشبھات کراع یرعی حول الحمی یوشک ان یواقعہ الا وان لکل ملک حمی الا ان حمی اللّٰہ فی ارضہ محارمہ ۔

/ بخاری کتاب الایمان /

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے :

لا یبلغ العبد حقیقۃ التقوی حتی یدع ما حاک فی الصدر / بخاری

تیسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی ان چیزوں سے بھی پرہیز کرنے لگے جو فی نفسہ مباح تو ہوں لیکن فی الحقیقت وہ محرمات و مشتبہات کا دروازہ کھولنے والی ہوں ، اس کا اندیشہ ہو کہ ان کے کرنے سے آدمی محرمات میں پڑ جائے گا ، حضور کی حدیث اس کی دلیل ہے ارشاد ہے :

لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتی یدع ما لا

[illegible]

سید شبیر احمد

ہامان کی اثری تحقیق

ہامان نام کی دو شخصیتوں کا ذکر دو مقدس کتابوں میں ملتا ہے۔ ان میں سے قدیم تر ہامان کا ذکر قرآن مجید میں چھ مقامات پر آیا ہے جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

ا۔ ان فرعون علا فی الارض وجعل اھلھا شیعا یستضعف طائفۃ منھم یذبح ابناءھم ویستحی نساءھم انہ کان من المفسدین ○ ونرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض ونجعلھم ائمۃ ونجعلھم الوارثین ○ ونمکن لھم فی الارض ونری فرعون وھامان وجنودھما منھم ما کانوا یحذرون ○

(القصص — ۴ تا ۶)

بے شک فرعون سرزمین مصر میں بہت سرکش ہو گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو مختلف طبقوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ان میں سے ایک گروہ یعنی بنی اسرائیل کو اس نے دبا رکھا تھا ان کے بیٹوں کو ذبح کر ڈالتا اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا۔ بے شک وہ زمین میں فساد برپا کرنے والوں میں سے تھا اور ہم یہ چاہتے تھے کہ ان لوگوں پر احسان کریں جو ملک میں دبا کر رکھے گئے تھے اور ان (یعنی بنی اسرائیل) کو پیشوا بنائیں اور ان کو وراثت بخشیں، اور ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں، اور فرعون، ہامان اور ان کی فوجوں کو ان کے ہاتھوں وہ دکھائیں جس کا وہ اندیشہ رکھتے تھے۔

ب۔ فالتقطہ آل فرعون لیکون لھم عدوا وحزنا ○ ان فرعون وھامان وجنودھما کانوا خاطئین ○ (القصص — ۸)

تو فرعون کے گھر والوں نے اس (یعنی حضرت موسیٰ) کو اٹھا لیا تاکہ وہ ان کے لیے دشمن اور باعث غم بنے۔ بے شک فرعون، ہامان اور ان کے اہل لشکر سے بڑی چوک ہوئی۔

ج۔ وقال فرعون یا ایھا الملا ما علمت لکم من الہ غیری

اور فرعون نے کہا اے درباریو! میں تو تمہارے لیے اپنے سوا کسی اور معبود سے واقف نہیں تو

فاوقد لی یا ھامان علی الطین فاجعل لی صرحا لعلی اطلع الی الہ موسیٰ وانی لاظنہ من الکاذبین ○

(القصص — ۳۸)

اے ہامان! تم مٹی کی اینٹوں کا پزاوہ لگاؤ اور میرے لیے ایک اونچا محل بنواؤ کہ میں موسیٰ کے خدا کو جھانک کر دیکھوں، میں تو اس کو ایک جھوٹا آدمی خیال کرتا ہوں۔

د۔ وقارون وفرعون وھامان ولقد جاءھم موسیٰ بالبینت فاستکبروا فی الارض وما کانوا سابقین ○ (العنکبوت — ۳۹)

اور قارون، فرعون اور ہامان کو بھی ہم نے ہلاک کر دیا اور موسیٰ ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر آیا تو انھوں نے ملک میں گھمنڈ کیا اور وہ ہمارے قابو سے باہر نکل جانے والے نہ بن سکے۔

ہ۔ ولقد ارسلنا موسیٰ بآیتنا وسلطن مبین ○ الی فرعون وھامان وقارون فقالوا سحر کذاب ○ فلما جاءھم بالحق من عندنا قالوا اقتلوا ابناء الذین امنوا معہ واستحیوا نساءھم ○ وما کید الکفرین الا فی ضلل ○

(المومن — ۲۳،۲۵)

اور ہم نے بھیجا موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور ایک واضح سند کے ساتھ فرعون، ہامان اور قارون کی طرف۔ تو انھوں نے کہا کہ یہ تو ایک جادوگر ہے جھوٹا ہے۔ پس جب وہ آیا ان کے پاس ہمارے پاس سے حق لے کر، انھوں نے کہا ان لوگوں کے بیٹوں کو قتل کر دو جو اس کے ساتھ ایمان لائے ہیں اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھو اور ان کافروں کی چال بالکل رائگاں گئی۔

و۔ وقال فرعون یھامان ابن لی صرحا لعلی ابلغ الاسباب ○ اسباب السموت فاطلع الی الہ موسیٰ وانی لاظنہ کاذبا ○ وکذلک زین لفرعون سوء عملہ وصد عن السبیل ○ وما کید فرعون الا فی تباب ○

(المومن — ۳۶،۳۷)

اور فرعون نے کہا اے ہامان! میرے لیے ایک عمارت بنا کہ میں اطراف میں پہنچوں، آسمانوں کے اطراف میں، پس موسیٰ کے رب کو جھانک کر دیکھوں۔ میں تو اس کو بالکل جھوٹا خیال کرتا ہوں اور اس طرح فرعون کی نگاہوں میں اس کی بدعملی کھبا دی گئی اور وہ [illegible] روک دیا گیا اور فرعون کی چال [illegible] ہو کر رہ گئی۔

ان چھ مقامات کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس فرعون مصر کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے، ہامان اس کے اعیان و ارکانِ سلطنت میں شمار ہوتا، زیادہ بااثر، مقتدر، صاحبِ جاہ و حشم اور معتمد تھا۔ نیز وہ مذہبی امور میں فرعون کا صلاح کار تھا، اور اینٹیں پکوا کر ایک فلک بوس عمارت بنوانے پر قادر تھا اور وہ فرعون کی طرح افواجِ قاہرہ کا سالارِ اعظم بھی تھا۔

دوسرے ہامان کا ذکر عہد نامہ عتیق (OLD TESTAMENT) کی کتاب آستر میں ہے جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ہامان ایران کے ایک بادشاہ خسویرس (AHASUERUS) کا وزیرِ اعلیٰ تھا۔ یہ ایرانی سلطنت کے تمام یہودیوں کی نسل کشی کے درپے تھا لیکن آستر نامی یہودی حسینہ نے شاہِ مذکور کو اپنے دامِ تزویر میں گرفتار کر لیا اور اس کی ملکہ بننے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کی فسوں گری اور سازش کے نتیجے میں یہ ہامان خود مع اپنے دس لڑکوں کے اس اونچی پھانسی پر لٹکایا گیا جو اس نے یہودیوں کے لئے تیار کرائی تھی۔

مستشرقین کی ایک جماعت نے جس کا سرگروہ مرشی (MARRACCIO) تھا اوّل الذکر ہامان کی تاریخی حیثیت پر ۱۶۹۸ء میں اعتراضات کا سلسلہ شروع کیا جس پر بعد میں جارج سیل، ڈاکٹر ویری، ڈوکسٹس، نوری، پروفیسر لیمنز، انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام نے اپنے اعتراضات کی بنیاد رکھی۔ ان اعتراضات کا ماحصل یہ ہے کہ ہامان دراصل، جیسا کہ کتاب آستر میں مذکور ہے، اخسویرس نامی شاہِ ایران کا وزیر ہی تھا لیکن حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ شدید تاریخی غلطی کھا کر طویل بُعدِ زمانے کے باوجود اسے فرعونِ موسیٰ کا وزیر بنا دیا۔ اور بائبل میں مذکور مینارِ بابل کے ذکر پر مبنی ایک غلط سلط کہانی بنا لی جس کے مطابق جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو خدائے واحد و یکتا کا پیغام پہنچایا تو اس نے ہامان کو حکم دیا کہ وہ مٹی کی اینٹیں پکوا کر ایک فلک بوس عمارت تعمیر کروائے تاکہ اس پر چڑھ کر وہ آسمان پر جا کر دیکھے تو سہی کہ وہاں موسیٰ کا خدا ہے بھی؟ گرچہ وہ اپنے دل ہی دل میں موسیٰ کو ایک جھوٹا جادوگر ہی خیال کرتا تھا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی مرحوم نے تفسیر ماجدی جلد پنجم کے صفحہ ۷۸۰ پر تحریر فرمایا ہے "جس طرح ہامان کا حلقہ فرعون کے ساتھ بیان اوپر آگے چل کر بھی آیا ہے۔ اس سے تو قیاس یہی ہوتا ہے کہ جس طرح فرعون شخصی نام نہیں بلکہ شاہی لقب تھا اسی طرح ہامان بھی کوئی سرکاری لقب ہی تھا۔ تاریخ سے آنا تو بہرحال ثابت ہے کہ مصر کے ایک بہت بڑے دیوتا کا نام آمن (AMON) تھا۔ اس کے بڑے پجاری

کے وقتی ذات بادشاہ سے کچھ ہی کم ہوتے تھے، کیا عجب کہ اس بڑے پجاری کا سرکاری لقب عربی تلفظ میں ہامان ہی ہو!" یہی قیاس کا اظہار مولانا نے اپنی کتاب اعلام القرآن میں فرمایا ہے۔ البتہ انھوں نے اپنی انگریزی تفسیر میں سورۃ القصص کے نوٹ نمبر ۲۱۰ میں یہ تاثر دیا ہے کہ آمن دیوتا کے بڑے پجاری کا لقب ہی ہامان تھا۔ لیکن رالنسن کی کتاب مصرِ قدیم کے صفحہ ۲۸۹ جس کا حوالہ دیا گیا ہے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچتی۔ مولانا مرحوم کی تحقیق کا تتمہ بیشتر عجب تحقیق سے کچھ مختلف نہیں جو انھوں نے تاریخ صحفِ سماوی میں رقم کی ہے۔

مصرِ قدیم کے آثار کے ماہرین اور مشہور زمانہ مورخین کی بے لاگ تحقیقات نے حال ہی میں یہ ثابت کر دیا ہے کہ اوّل الذکر ہامان مسلّم الثبوت تاریخی حیثیت کا مالک تھا۔ پروفیسر فلنڈرز پیٹری (FLINDERS PETRIE) نے اپنی کتاب RELIGIOUS LIFE IN ANCIENT EGYPT کے صفحات ۲۰-۲۰ پر لکھا ہے کہ آمن دیوتا کی پرستش لیبیا کے نخلستانی علاقے سے شروع ہو کر مصر اور کاتھیج میں پھیلی جہاں اس کا نام "آمن" ہی رہا۔ بعد میں ہامان "بتدریج ہو گیا۔ اسی محقق نے اپنی ایک دوسری کتاب THE RELIGION OF ANCIENT EGYPT کے صفحہ ۳۱ پر لکھا ہے کہ تھیبس (THEBES) میں واقع اس دیوتا کے مندر کا بڑا پروہت مینڈھے کی کھال کا لبادہ زیب تن کر کے اور سر پر مینڈھے کے کھوپڑی پہن کر ہامان کا روپ اور نام اختیار کر لیتا تھا، گویا وہ اس بھیس میں خود آمن یا ہامان کہلانا تھا۔ اسی طرح سر والس بج (SIR WALLIS BUDGE) کی کتاب (EGYPTIAN RELIGION) کے صفحات ۱۰۵ تا ۱۰۶ اور پروفیسر مرفی کی کتاب ANCIENT EGYPTIAN RELIGION کے صفحات ۱۰۰ تا ۱۱۱ کے مطالعے سے مزید وضاحت ہو جاتی ہے کہ مصر کے رواج کے مطابق دوسرے دیوتاؤں کے پجاری اور پروہت بھی تو ان دیوتاؤں کا روپ اختیار کر کے ان کا کردار ادا کیا کرتے تھے۔ ریلیجن اینڈ ایتھکس کے انسائیکلوپیڈیا جلد دوم کے صفحہ ۱۹۵ کے مطالعے سے بھی اس حقیقت کی تصدیق ہوتی ہے کہ مصری دیوی دیوتاؤں کے پجاری اور پروہت ان دیوی دیوتاؤں کا بھیس اور نام اختیار کر لیتے تھے اور ان کا کردار ادا کیا کرتے تھے۔ الغرض آمن یا ہامان ... موسیٰ علیہ السلام کا ہم عصر تھا وہ ہامان تھا جس کا تذکرہ قرآن مجید نے فرعون کے ساتھ کیا ہے۔

پروفیسر ... SIR E. WALLIS BUDGE ... RELIGION OF ANCIENT EGYPT

کے صفحات ۹۶ تا ۹۷ پر لکھا ہے کہ ہامان، جس کا تخلص ہم اوپر لکھ چکے ہیں، دیوتاؤں کی عبادت اور اہرام کی تعمیر و مرمت کا مہتمم، دیوتا کی افواج کا سپہ سالار، خزانہ کا منصرم اور اناج کے ذخائر کا منتظم تھا۔ علاوہ ازیں ملک کے تمام دیوتاؤں کے چھوٹے بڑے پروہت اسی کے زیرنگین ہوتے تھے۔ اس کی کثیر دولت و ثروت اور اثر و رسوخ کا مزید اندازہ لگانے کے لئے پروفیسر بریسٹڈ کی کتاب (A HISTORY OF EGYPT) کے صفحات ۲۴۴ اور ۵۲۰ اور پروفیسر فلنڈرز پیٹری کی کتاب (RELIGIOUS LIFE IN ANCIENT EGYPT) کے صفحات ۴۵ تا ۵۵ ملاحظہ کرنے چاہئیں۔

فرعون کو جب حضرت موسیٰؑ نے خدائے واحد و یکتا پر ایمان لانے کی دعوت دی تو فرعون اور اس کے اعیان و ارکانِ سلطنت نے جن میں ہامان بھی شامل تھا اور قارون نے جو یہودی النسل تھا از راہِ تکبر ایمان لانے سے انکار کر دیا۔ فرعون خود کو دیوتا سمجھتا تھا اور خدائی کا دعویدار تھا۔ علاوہ ازیں وہ کوئی دو ہزار کے لگ بھگ دوسرے دیوتاؤں کو بھی مانتا تھا۔ اس نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت کو اپنی اور دیگر دیوتاؤں کی خدائی کے خلاف بغاوت تصور کیا۔ پروفیسر بریسٹڈ کی کتاب (DEVELOPMENT OF RELIGION AND THOUGHT IN ANCIENT EGYPT) کے صفحہ ۱۵۲ اور پیٹری کی کتاب (RELIGIOUS LIFE IN ANCIENT EGYPT) کے صفحات ۸۴ اور ۲۰۸، ۲۰۹ پر مذکور ہے کہ "سیڑھی لگا کر آسمان پر چڑھ کر دیوتاؤں سے ملنے" کا عقیدہ قدیم مصری مذہب کا ایک اہم جز تھا۔ اس لئے فرعون نے ہامان کو جو دیوتاؤں کی عمارتیں تعمیر کروانے پر بھی مامور تھا، یہ حکم دیا کہ وہ اینٹیں پکوا کر ایک فلک بوس عمارت بنوائے۔ تاکہ وہ اس پر چڑھ کر موسیٰؑ کے خدا کو دیکھ لے۔ گو دل ہی دل میں اسے پہلے سے یقین تھا کہ موسیٰؑ جھوٹا جادوگر ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بے شمار مصری غلام اینٹیں بنانے پر مامور تھے جس کا ذکر پیٹری کی کتاب (EGYPT AND ISRAEL) صفحات ۳۱ تا ۳۳ پر کیا گیا ہے۔ فرعون کا مذکورہ حکم اس وقت کے مذہبی عقائد کے مطابق تھا اور اس سے تمسخر یا تعجب کا کوئی پہلو نہیں نکلتا جیسا کہ ہمارے چند مفسرین نے بیان کیا ہے۔

اب یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اپنے معترضین کے اعتراضات کے اصل ماخذ یعنی کتاب آستر اور اس میں مذکور ہامان کی تاریخی حیثیت کا جائزہ لیں، جسے بطور کسوٹی اختیار کر کے انہوں نے اعتراضات کا طومار کھڑا کر دیا ہے۔ ہم قارئین کی توجہ جیوش انسائیکلو پیڈیا کی جلد ۵ کے صفحات ۲۳۵ و ۲۳۶،

یونیورسل جیوئش انسائیکلو پیڈیا کی جلد ۴ کے صفحہ ۱۶۳، ایک جلدی تفسیر بائبل صفحہ ۳۹۳ اور انسائیکلو پیڈیا بریٹینکا کی جلد ۲ کے کالم ۱۴۰۰ تا ۱۴۰۶ پر مرقوم مواد کی طرف مبذول کراتے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے ہم اس حتمی فیصلہ پر پہنچتے ہیں کہ کتاب آستر کی قطعاً کوئی تاریخی حیثیت نہیں۔ اکثر علمائے یہود و نصاریٰ اسے ایک عشقیہ رومان سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔ نیز ہامان سمیت اس کے کردار فرضی ہیں۔ ڈکشنری آف بائبل مؤلفہ جیمز ہیسٹنگز کے صفحہ ۲۴۰ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب آستر کے مصنف نے بابلی اور عیلامی دیوتاؤں یعنی ہمان، مردوک اور عشتار کے ناموں کو بگاڑ کر اپنے اہم کرداروں کے نام، ہامان، مردکی، اور آستر رکھ دیئے ہیں۔ نیز یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ پہلی دو صدی عیسوی تک علمائے یہود میں یہ مسئلہ بحث و نزاع رہا کہ کتاب آستر کو عہد نامہ عتیق میں شامل کیا جائے یا رد کیا جائے۔ بالآخر اسے شامل کرنے کا فیصلہ محض اس وجہ سے کیا گیا کہ آستر کے افسانہ پر یہودیوں کے مقبول عام تہوار پوریم (PURIM) کی بنیاد رکھی گئی ہے اور عوام کی رائے یہی تھی کہ اسے ان کی نام نہاد الہامی اور آسمانی کتاب کا حصہ بنایا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہو کر رہا۔ اس پر طرّہ یہ کہ چونکہ کتاب آستر کے اصلی مصنف نے اس میں نہ تو خدا کا ذکر کیا تھا اور نہ کسی مذہبی عبادت کا، اس لئے بعد کے ایک مصنف نے اس میں [illegible] اور اس طرح یہ کتاب تحریف سے بھی محفوظ نہ رہ سکی۔ [illegible] کتاب آستر بائبل میں شامل ہی نہ ہوتی۔

الغرض تحقیق کی رو سے مستشرقین کے علی الرغم کتاب آستر کے ہامان کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں جبکہ قرآن مجید میں ہامان کا جو ذکر ہے، اس کے ایک ایک لفظ کو جدید تاریخی تحقیق نے بالکل صحیح پایا ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ قرآن پاک میں درج ہامان کی تفصیل سے یہود و نصاریٰ کے صحیفے یکسر خالی ہیں۔ اس سے ہر ذی عقل انسان اس نتیجہ تک پہنچے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت یہود و نصاریٰ کے کسی عالم، کاہن، نبی یا مورخ کو ہامان کی شخصیت کا کوئی علم نہ تھا، لہٰذا آنحضرتؐ یہود و نصاریٰ کے کسی عالم یا کسی غیر عرب آلیق سے سن کر یہ تذکرہ قرآن مجید میں درج نہیں کر سکتے تھے، جیسا کہ مستشرقین کا دعویٰ ہے۔ ان تفاصیل سے تو انسائیکلو پیڈیا بریٹینکا کے فاضل مؤلفین اور تاریخ کے مشہور محقق [illegible]۔ اور ان کی تحقیق کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن بلا شبہ [illegible] آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صادق و سچے رسول ہونے کی ایک دلیل روشن ہے۔ ••

تعارف و تبصرہ

ماہنامہ رہ گذر ۔ دہلی

دو روزہ آل انڈیا ہسٹری کانفرنس نمبر

1-13/58, Humaun Nagar
Hyderabad 500028
جلد نمبر ۵ شمارہ نمبر ۹ ستمبر، اکتوبر ۱۹۹۷ء
مدیر ۔ عبدالحفیظ صاحب
صفحات ۲۵۴ قیمت Rs. 10/-

رہ گذر ۔ دہلی اسلامک اکیڈمی آف انڈیا کا ماہانہ ترجمان ہے۔ اس کا سالانہ زر تعاون 50/- روپیہ ہے۔ اکیڈمی کا تعارف صدر اکیڈمی کے اپنے الفاظ میں: "یہ کوئی تحریک یا جماعت نہیں ہے بلکہ تاریخ کے موضوع پر ایک علمی اور تحقیقی، تصنیفی اور اشاعتی ادارہ ہے۔ اس کا محرک رضائے الٰہی، بنیادی مقاصد میں اقامت دین اور اسلامی تحریکات کو علمی و تاریخی غذا پہنچانا اور اسے تقویت پہنچانا ہے۔ مثبت مقصد تو یہ ہے کہ مسلمانوں میں عموماً اپنی صحیح تاریخ اور حالات حاضرہ کا صحیح اور تعمیری شعور پیدا کرنا اور خصوصاً نوجوانوں اور طالب علموں کی ذہنی اور فکری کردار کی تعمیر میں تاریخ کا جتنا پارٹ ہے، وہ فراہم کرنا، تاکہ اس پہلو سے کوئی خلا باقی نہ رہ جائے۔" صفحہ ۵

اس اکیڈمی نے ۱۵، ۱۶ اگست ۱۹۹۷ء کو "۵۰ سالہ دور آزادی ہند اور مسلمان ۔ کیا کھویا اور کیا پایا؟" کے موضوع پر ایک دو روزہ کانفرنس منعقد کی۔ یہ خصوصی شمارہ اسی کانفرنس کے مقالات، تقاریر اور روداد پر مشتمل ہے اور ایک قابل مطالعہ دستاویز ہے۔ اس میں جناب جسٹس رفیع الدین قدوائی، جناب سید حامد صاحب، جناب ڈاکٹر نثار احمد فاروقی، جناب مولانا ابو العرفان ندوی، جناب جلال الدین انصر عمری، جناب ڈاکٹر انور معظم، جناب ڈاکٹر احمد اللہ خان، جناب مولانا حمید الدین عاقل، جناب مولانا عبدالعزیز صاحب، جناب مولانا سلیمان سکندر صاحب، جناب ڈاکٹر سید معین الدین قادری، جناب ڈاکٹر عبدالمجید خان صاحب، محترمہ ڈاکٹر فہمیدہ عالم صاحبہ، کے مقالات، تقاریر اور پیغامات شامل ہیں جو ۵۰ سالہ دور آزادی ہند کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یوں تو ہر مقالہ اور تقریر اپنے موضوع پر بہت ہی جامع اور بھرپور ہے اور بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے تحریر کیا گیا ہے مگر مولانا جلال الدین انصر عمری، ڈاکٹر احمد اللہ خان، جناب سید حامد علی سابق وائس چانسلر علی گڑھ، جسٹس رفیع الدین اور مولانا عرفان ندوی کا مقالہ خصوصی مطالعہ

بقیہ صفحہ ۶۳ پر

اداریہ

جامعہ کے لیل و نہار

تعطیل ششماہی

جس وقت یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا طلبۂ جامعہ ششماہی امتحانات سے فارغ ہو چکے ہوں گے اور اپنے اپنے گھروں کو جا چکے ہوں گے اور وہاں اپنے والدین کو یہ موقع فراہم کریں گے کہ وہ اپنے بچوں کو دیکھیں پرکھیں اور خامیوں، کوتاہیوں اور کمیوں کی نشاندہی کریں۔ آپ کے قیمتی مشورے ہمارے بچوں کی تعلیم و تربیت کے ضمن میں جامعہ کے لئے مفید اور مددگار ثابت ہوں گے۔

رضی الدین صاحب کو پارٹی

ملازمت سے سبکدوشی پر جناب رضی الدین صاحب کو ۱۹۹۸ء کو تمام اساتذہ نے الوداعی پارٹی دی۔ گرم اور پر لطف چائے کی چسکیوں کے بعد صدر محترم جناب عبدالمجیب صاحب کی آواز نے ماحول کو یکدم سنجیدہ بنا دیا تمام لوگ ہمہ تن گوش ہو گئے اور صدر محترم کی آواز ماحول میں ارتعاش پیدا کرنے لگی ۔ "جناب رضی الدین صاحب نے ایک عرصہ تک جامعہ کی خدمت کی ہے اور ایک ایسی جگہ سے ان کا تعلق رہا جہاں ہر ایک سے سابقہ ناگزیر تھا، ہو سکتا ہے ہماری کسی بات سے یا کسی کام سے ان کو تکلیف پہنچی ہو تو میں خود اپنی ذات کی طرف سے اور تمام اساتذہ کی طرف سے موصوف سے معافی کا خواستگار ہوں، اور میں امید کرتا ہوں کہ موصوف جہاں بھی رہیں گے جس طرح بھی ممکن ہو جامعہ کی خدمت کرتے رہیں گے۔ جہاں کہیں بھی رہیں خدا صراط مستقیم پر قائم اور اپنے حفظ و امان میں رکھے۔"

رضی الدین صاحب ۱۵ ستمبر ۱۹۶۹ء کو دفتر انتظامیہ تشریف لائے اور اپنی ذمہ داری سنبھالی۔ اس وقت سے آج تک مسلسل جامعہ کی خدمت کرتے رہے اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ موصوف ۲۸، ۲۹ ستمبر ۱۹۹۸ء کو ... میرے اپنے علم کے مطابق دفتر انتظامیہ

میں مسلسل آٹھ سال تک ایننگ کوئی نہیں رہا۔

رضی الدین صاحب جب احباب کا شکریہ ادا کرنے کھڑے ہوئے تو جذبات آنسوؤں کی شکل میں بہنے لگے۔ رومال میں آنسو جذب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا "میں ایک ایسی جگہ سے وابستہ رہا ہوں جہاں پر آپ تمام لوگوں سے سابقہ پڑا ہے ممکن ہے آپ کو میری ذات سے کوئی تکلیف پہنچی ہو میں اس کے لئے آپ تمام احباب سے معافی کا خواستگار ہوں اور اب دوسری شکل میں میں جامعہ کی خدمت کرسکتا ہوں، اور انشاءاللہ کرتا رہوں گا۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ ہمیں صراط مستقیم پر قائم ودائم رکھے"۔

— بقیہ (رہ گذر ......)

کے لائق ہے۔

ہندوستان کی تاریخ کے تدوین کا فیصلہ اکیڈمی کا ایک اہم اور بروقت فیصلہ ہے یہ کام آج کے حالات میں اور بھی ضروری ہو گیا ہے۔ ہندوستانی مسلم ملت کی تاریخ، مختلف جگہوں پر جستہ جستہ تو ملتی ہے لیکن مکمل، جامع اور مربوط تاریخ ابھی تک ترتیب نہیں دی جاسکی۔ اس کے لئے چاہیے جتنا سرمایہ بھی درکار ہو، امت کے مخیر حضرات کو آگے آنا چاہیے اور اس کار خیر میں اپنا پارٹ ادا کرنا چاہیے۔

— بقیہ۔ تقویٰ .....

باس به حذرا مما به باس / ریاض الصالحین بحوالہ ترمذی

یہ ہیں تقویٰ کے مدارج جو قرآن وسنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی ترتیب نہایت اہم چیز ہے۔ اگر کوئی متقی بننا چاہتا ہے اور یہ بھی چاہتا ہے کہ برابر اس راہ میں بڑھتا جائے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اسی ترتیب کو پیش نظر رکھ کر اپنی تربیت کرے۔ اگر ایسا نہیں کرتا ہے تو یہ ممکن ہے کہ وہ متقیوں جیسا لگنے لگے۔ لوگوں کو اس کی ظاہری زندگی دیکھ کر یہ گمان ہو جائے کہ یہ متقی ہے لیکن اس میں وہ تقویٰ نہیں پیدا ہو سکتا جس کے انعام میں وہ نعمتیں ہیں جن کے ذکر سے قرآن کے صفحات بھرے ہیں۔

انشاءاللہ

انجمن طلبہ قدیم جامعۃ الفلاح کا چوتھا

دو سالہ اجلاس

۱۲، ۱۳، ۱۴ فروری ۱۹۸۸ء کو

مادر علمی جامعۃ الفلاح میں منعقد ہو رہا ہے

انصار احمد فلاحی